تعلیم و تربیت

نیا سلسلہ **کارٹون کہانی**

چوتھی قسط **قائدِ اعظمؒ** اور منفرد سلسلہ

روبن سن کروسو
ROBINSON CRUSOE
چھٹی قسط

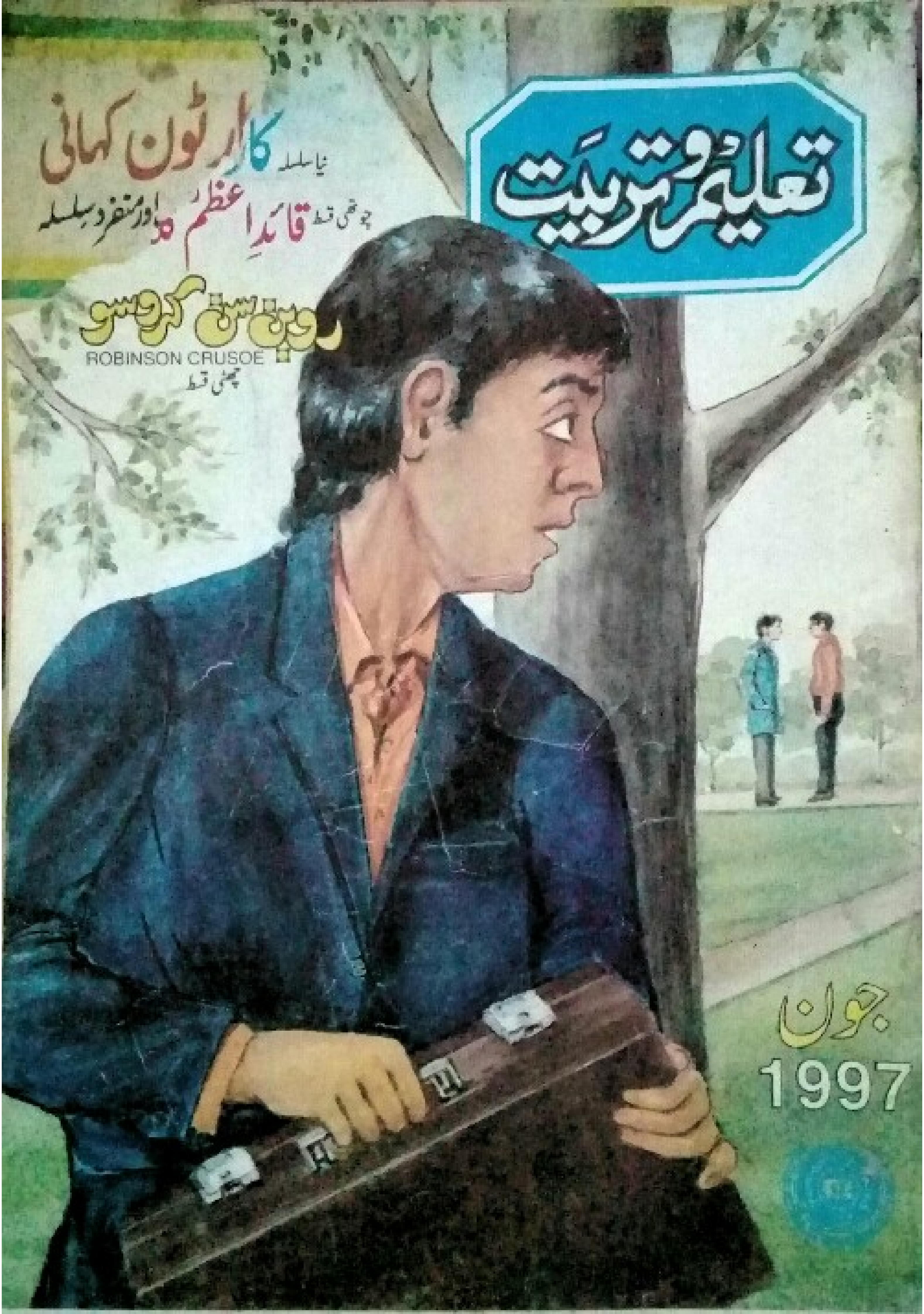

جون
1997

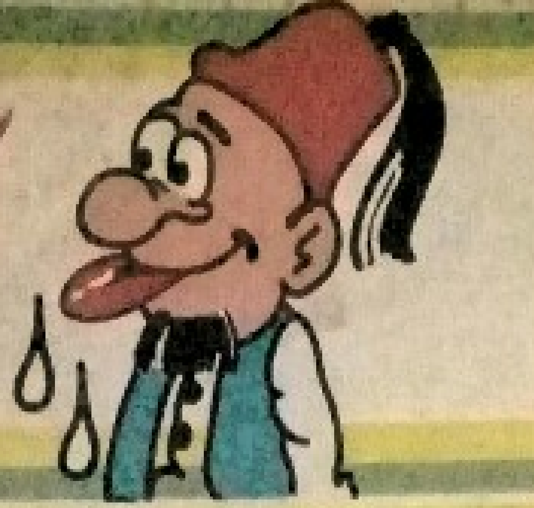

کارٹون کہانی

ایک دلچسپ اور منفرد سلسلہ

57 واں سال تیسرا شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ چھپنے والا [illegible]

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ!

ہمارے تقریباً تمام ساتھیوں نے تعلیم و تربیت کے سال نامے کو بے حد پسند کیا ہے۔ لیکن بعض ساتھیوں کو ایک شکایت ہے کہ اس کے صفحات بہت کم ہیں۔ کم از کم دوگنے ہونے چاہییں تھے۔ ہم نے دوگنے صفحات اس لیے نہیں کیے کہ ایسا کرنے سے قیمت بڑھ جاتی۔ اب آپ بتائیں کہ اگست 1997ء میں شائع ہونے والے "آزادی نمبر" کے صفحات دوگنے کر کے قیمت بڑھا دی جائے یا قیمت اور صفحات اتنے ہی رہنے دیے جائیں۔

اس مہینے سے اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ ان چھٹیوں میں خوب دل لگا کر اپنا ہوم ورک کیجیے۔ آپ کی چھٹیوں کے دوران میں ہم ان شاء اللہ ایسے دل چسپ شمارے شائع کریں گے کہ آپ خوب لطف اٹھائیں گے۔ چھٹیوں میں آپ اگر کسی پُرفضا مقام پر جائیں تو اس سفر کا حال ضرور لکھیے تاکہ وہ ساتھی جو کسی وجہ سے ان پُرفضا مقامات کی سیر نہ کر سکیں وہ اس خوشی میں شریک ہو سکیں۔

سال نامے میں شائع ہونے والی کارٹون کہانی کو ساتھیوں نے بہت پسند کیا اور آئندہ بھی ایسی کہانیاں شائع کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا ہے۔ اس مہینے سے کارٹون کہانی کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع کیا جا رہا ہے کیونکہ ہمیں آپ کی پسند کا بہت خیال رہتا ہے۔ لیکن کیا بات ہے آپ نے ابھی تک آزادی نمبر کے لیے اپنی تجویزیں اور تحریریں بھیجنا شروع نہیں کیں؟ ایڈیٹر

اس شمارے میں

اداریہ		1
اصول کا پول (نظم)	جاوید اقبال [illegible]	2
الو کا شاگرد [illegible]	سید ظفر [illegible]	3
[illegible] کا انجام (کہانی)	محمد زکی حسرت	6
چھلاوا (کہانی)	[illegible]	9
بریف کیس (کہانی)	[illegible]	13
ہم ہوا ساتھی (نظم)	حسن ذکی کاظمی	16
[illegible] (کہانی)	محمد سراج	19
ہمارے ملک کی پیاری [illegible]	ڈاکٹر عبدالرؤف	23
ماسٹر [illegible] (کہانی)	[illegible]	24
[illegible]		29
معصوم [illegible]	عبدالستار خان طاہر	31
(تعلیم بالغاں)	سید شرکت اللہ	34
آپ کے ستارے اور لطائف		35
آزادی [illegible]		37
ایک بے باک سپاہی	ڈاکٹر رضوان ثاقب	38
مشن ناممکن (کہانی)	[illegible]	42
آپ کا خط		49
[illegible]		52
کارٹون کہانی	[illegible]	53
آپ بھی لکھیے		54
ہم آزاد ہوں گے (نظم)	عبدالحفیظ ظفر	55
بلا عنوان (انعامی)		60
تقریب تقسیم انعامات [illegible]		61
قائد اعظم کا [illegible] (پہلی قسط)		62
[illegible] (پہلی قسط)	[illegible]	64

قیمت فی پرچہ -/15 روپے

جون 1997ء

سرورق

بریف کیس

پتہ: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32- شاہراہ بن بادیس لاہور فون: 6361309-6361310 6278816-6278816

ڈھول کا پول

جاوید امتیازی

بڑا کبھی تو بول نہ بول
کھل جائے گا ڈھول کا پول

شیخی مت بگھار اے، پیارے
دامن اپنا جھاڑ اے پیارے
پیار کی راہ سدھار اے پیارے
پیار محبت کا رس کھول
کھل جائے گا ڈھول کا پول

یاد رہے یہ میرا کہنا
سچ صداقت، تیرا گہنا
جھوٹ کوئی تو بات نہ کہنا
بات کو پہلے اپنی تول
کھل جائے گا ڈھول کا پول

ڈھول کی سن لے بات نرالی
جتنا گونجے، اتنا خالی
نیچی ڈالی، پھولوں والی
بڑا کبھی تو بول نہ بول
کھل جائے گا ڈھول کا پول

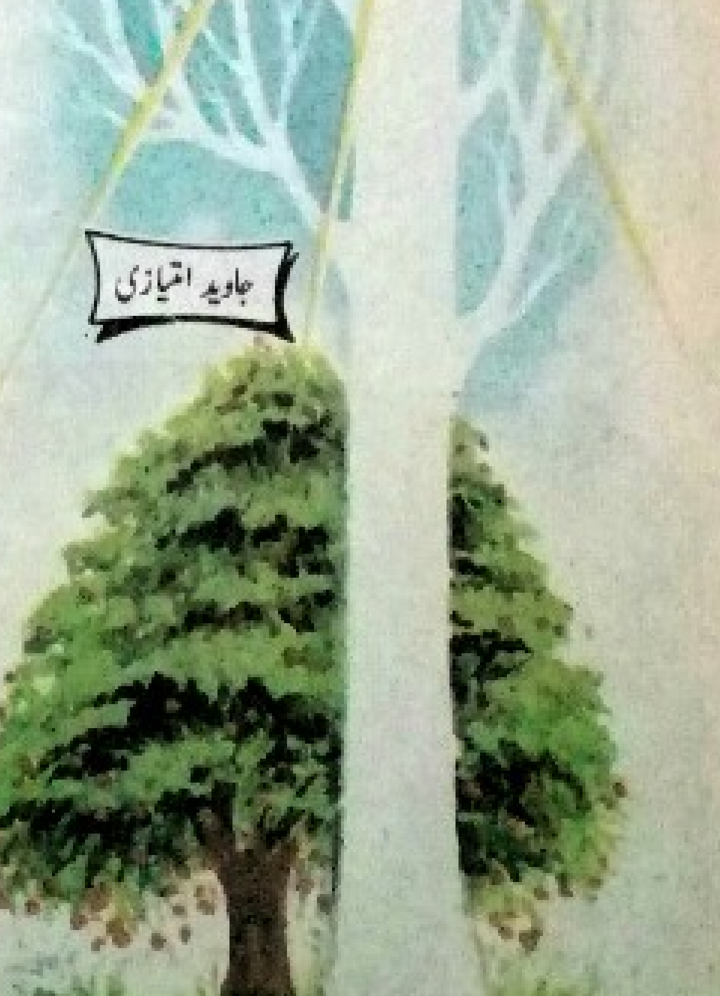

نام ور لوگ

انوکھا شاگرد

سید نظر زیدی

اب سے کوئی ایک ہزار برس پہلے کی بات ہے شہر بغداد میں ایک بہت ہی قابل طبیب رہتا تھا۔ اس کا نام ابوالحسن سعید تھا۔ اس کی شہرت پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں کا علاج کرنے کے علاوہ وہ طالب علموں کو علم طب کی تعلیم بھی دیتا تھا اور اس کی درس گاہ میں زیادہ تر امیروں، وزیروں کے بچے پڑھتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے ابوالحسن اپنے شاگردوں کو پڑھا رہا تھا کہ ایک دیہاتی لڑکا آیا اور بہت ادب سے سلام کرنے کے بعد بولا "جناب عالی! مجھے علم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔ میری درخواست ہے کہ مجھے اپنا شاگرد بنا لیں۔ میں بہت غریب ہوں آپ کو فیس تو نہ دے سکوں گا لیکن دل و جان سے آپ کی خدمت کیا کروں گا"۔

غریب لڑکے کی یہ بات سن کر ابوالحسن اور اس کے شاگرد اس کی طرف دیکھنے لگے اور انہیں اس کی یہ بات بہت ہی نرالی لگی کہ اس حالت میں وہ علم حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے اور وہ بھی ابوالحسن سعید جیسے نامی گرامی طبیب سے جو بڑے بڑے سرداروں اور امیروں کے بچوں کو پڑھاتا ہے۔ اس لڑکے کی بات ان سب کو یوں عجیب لگی کہ اس کے کپڑے میلے کچیلے اور چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا اور وہ ایسا نڈھال اور کمزور نظر آ رہا تھا جیسے کئی وقت سے کھانا نہ کھایا ہو۔

لڑکے کی حالت دیکھ کر شاگردوں میں سے تو کئی مسکرانے لگے۔ جیسے کہ رہے ہوں "واہ بھئی واہ، اس حالت میں علم حاصل کرنے چلے ہو، اور وہ بھی ابوالحسن سعید جیسے لائق فائق طبیب سے، یہ منہ اور مسور کی دال"۔ لیکن خود ابوالحسن کچھ دیر اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے اس پر ترس آگیا ہو۔ پھر سمجھانے کے انداز میں بولا "میاں صاحب زادے، تمہارا شوق اپنی جگہ، لیکن تعلیم حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ ذہین اور محنتی ہونے کے ساتھ روپیا پیسا بھی بہت خرچ کرنا پڑتا ہے اور تمہارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے، اس کے علاوہ ایک یہ بات بھی ہے کہ جن بچوں کو میں پڑھا رہا ہوں وہ یہ بات پسند نہ کریں گے کہ تم ان کے ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل کرو، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے پاس نوکری کرو۔ ہمیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت بھی ہے جو تعلیم دیتے وقت حاضر رہا کرے اور ہمیں یا ہمارے شاگردوں کو کوئی کام کروانا ہو تو کر دیا کرے۔ کہو، کرو گے نوکری؟"

طبیب کی یہ بات سن کر غریب لڑکا کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر رنج بھری آواز میں بولا "جناب' میں آیا تو علم حاصل کرنے کے لیے ہوں' اور ایک ایسے گاؤں سے آیا ہوں جو یہاں سے بہت دور ہے' لیکن یہ بات میری سمجھ میں آئی ہے کہ یہ شوق پورا کرنے کے لیے کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے' چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک اس قابل نہیں ہو جاتا آپ کی نوکری کر لوں"۔

طبیب خوش ہو کر بولا "ماشاء اللہ سمجھ دار لگتے ہو' لو خوش ہو جاؤ۔ ہم نے تمہیں نوکر رکھ لیا۔ روٹی کپڑے کے علاوہ کچھ تنخواہ بھی دیں گے اور رہنے کے لیے جگہ بھی' اسی وقت سے کام شروع کر دو۔ باہر بیٹھ جاؤ اور جو کام کہا جائے کرو"۔

"بہت بہت شکریہ جناب' اتنا بھی بہت ہے کہ رہنے کا ٹھکانا مل گیا۔ اللہ مالک ہے اور سامان بھی ہو جائے گا" لڑکے نے کہا اور اس کرسی پر جا بیٹھا جو باہر کے دروازے پر دربان کے لیے رکھی گئی تھی۔

اس واقعے کو چار پانچ مہینے گزر گئے۔ دیہاتی لڑکا بہت محنت اور بہت ادب سے وہ کام کرتا رہا جو اسے بتائے جاتے تھے۔ جس کمرے میں طالب علم پڑھتے تھے اس کی صفائی کرنا' کتابیں جھاڑنا پونچھنا' قلم اور دواتیں ٹھیک حالت میں رکھنا اور استاد اور شاگردوں کے چھوٹے موٹے کام بھی کچھ اس کے ذمے تھے اور وہ یہ سارے کام یوں دوڑ دوڑ کر کرتا تھا جیسے اسے ان کے کرنے کا بہت شوق ہو۔

یہ سب کام کرتے کرتے وہ اچھا خاصا تھک جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی یہ عادت بنائی تھی کہ فرصت کے دو چار منٹ بھی ملتے تھے تو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کمرے کے دروازے پر آ بیٹھتا تھا جس میں طالب علم پڑھا کرتے تھے اور چپ چاپ استاد صاحب کی باتیں سنتا رہتا تھا۔

ایک دن وہ اسی طرح دروازے پر بیٹھا تھا کہ استاد نے ایک طالب علم سے کوئی سوال پوچھا اور وہ اس کا ٹھیک جواب نہ دے سکا۔ پھر استاد صاحب نے وہی سوال باری باری سب طالب علموں سے پوچھا اور ان میں سے کوئی بھی سوال کا ٹھیک جواب نہ دے سکا۔ اس پر استاد صاحب کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے اپنے نالائق شاگردوں کو خوب برا بھلا کہا اور غصے کی حالت میں اٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔

غریب دیہاتی لڑکا خاموش بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ استاد صاحب اپنی مسند سے اٹھ کر جوتے پہننے لگے تو آگے بڑھ کر بہت ادب سے بولا "اگر جناب اجازت دیں تو اس سوال کا جواب میں عرض کروں؟"

"تم اس سوال کا جواب دے سکتے ہو؟" استاد صاحب نے رک کر حیرت سے لڑکے کو دیکھا۔

"جی جناب' مجھے اس سوال کا جواب معلوم ہے اور وہ یہ ہے" یہ کہ کر لڑکے نے سوال کا بالکل ٹھیک جواب سنا دیا۔ استاد صاحب پلٹ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے اور لڑکے کو اپنے پاس بلا کر پوچھا "بیٹے' یہ تو بتاؤ' تمہیں اس مشکل سوال کا جواب کیسے معلوم ہوا؟"

"یہ سوال اور اس کا جواب میں نے جناب کی زبان سے کئی بار سنا ہے۔ بات یہ ہے جناب' کہ جب کوئی کام نہیں ہوتا تو میں اس کمرے کے دروازے پر باہر کی طرف آبیٹھتا ہوں اور خوب غور سے جناب کی باتیں سنتا رہتا ہوں اور پھر وہ باتیں دوہرا کر اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں" لڑکے نے جواب دیا۔

"سبحان اللہ' سبحان اللہ۔ برخوردار' تم تو ماشاء اللہ بہت ہی سعادت مند ہو۔ ان نالائقوں کو ہم ایک ایک بات کئی کئی مرتبہ سمجھاتے ہیں اور یہ پھر بھی یاد نہیں رکھتے۔ ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ اچھا اب تم یوں کرو کہ ہمارے درس میں باقاعدہ شامل ہوا کرو۔ ہم تمہارے لیے کتابوں کا بندوبست کر دیں گے اور کام کاج کے لیے کوئی اور نوکر رکھ لیں گے۔ اللہ

پاک نے اپنی خاص مہربانی سے تمہیں بہت اچھا ذہن دیا اور ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا شوق بھی بخشا ہے۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ ان شاء اللہ تم بہت بڑے عالم بنو گے۔ یوں سمجھو کہ آج سے تم ہمارے نوکر نہیں' بلکہ بیٹے ہو" استاد صاحب نے کہا اور لڑکے کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ اس وقت وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا انہیں بہت بڑا خزانہ مل گیا ہے۔

ان استاد صاحب کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ غریب دیہاتی لڑکے نے ایسے شوق سے تعلیم حاصل کی کہ اپنے سب ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ دس بارہ سال بعد جب اس کی عمر بائیس برس تھی وہ اتنا بڑا عالم بن چکا تھا کہ نہ صرف بغداد بلکہ پورے ملک میں اس جیسا کوئی اور عالم نہ تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان بہت بڑی سلطنت کے مالک تھے۔ شان و شوکت اور علم کو ترقی دینے میں کوئی اور قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ مسلمان بادشاہ اور امیر وزیر عالموں کی بہت قدر کرتے تھے۔ انہیں بڑے بڑے عہدے دیتے تھے اور ان کے لیے ایسی آسانیاں پیدا کرتے تھے کہ وہ اپنا پورا وقت علوم اور فنون کو ترقی دینے کے کاموں میں خرچ کریں۔

جس غریب دیہاتی لڑکے کی یہ کہانی ہے جب وہ بڑا عالم بنا تو اسے ہبۃ اللہ ابو البرکات بغدادی کے نام سے پکارا گیا۔ اسے شاہی دربار میں کرسی دی گئی اور اس نے اپنی قابلیت اور محنت سے ایسے کارنامے انجام دیے کہ قیامت تک اس کا نام زندہ رہے گا۔

جس عالم کا اس کہانی میں ذکر آیا ہے اس نے پانی اور ہوا کے بارے میں تحقیق کی اور یہ معلوم کیا کہ زمین سے پانی کے چشمے کیوں اور کس طرح ابلتے ہیں' آندھی کیوں آتی ہے اور سمندروں میں طوفان کیوں اٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے انسانوں کے اخلاق کو اچھا بنانے کے لیے بہت عمدہ کتابیں بھی لکھیں اور طب کے علم کو ترقی دینے کے لیے بھی کام کیا۔

ہبۃ اللہ ابو البرکات کی طرح اور کتنے ہی مسلمان عالم ہیں جنہوں نے علم کیمیا' جغرافیہ' تاریخ' ریاضی اور الجبرا کی بنیاد رکھی اور اپنی قابلیت سے ایسے طریقے معلوم کیے جنہیں اپنا کر اس دنیا کو ایسا اچھا بنایا گیا۔

ان میں ہبۃ اللہ کا مقام یوں بہت اونچا ہے کہ اس نے بہت غربت کی حالت میں علم کا تاج اپنے سر پر سجایا اور پھر اپنی محنت اور قابلیت سے انسانی برادری کو بہت فائدہ پہنچایا۔ وہ اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب سلجوقی ترک حکم ران تھے۔ اس کی تاریخ پیدائش 1060ء اور تاریخ وفات 1100ء بتائی جاتی ہے۔ اس کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر دل میں سچا شوق ہو تو بہت برے حالات میں بھی علم حاصل کیا جا سکتا اور علم حاصل کر کے انسان اس سے کام لے تو شہرت کے آسمان پر چاند اور سورج کی طرح جگ مگا سکتا ہے۔

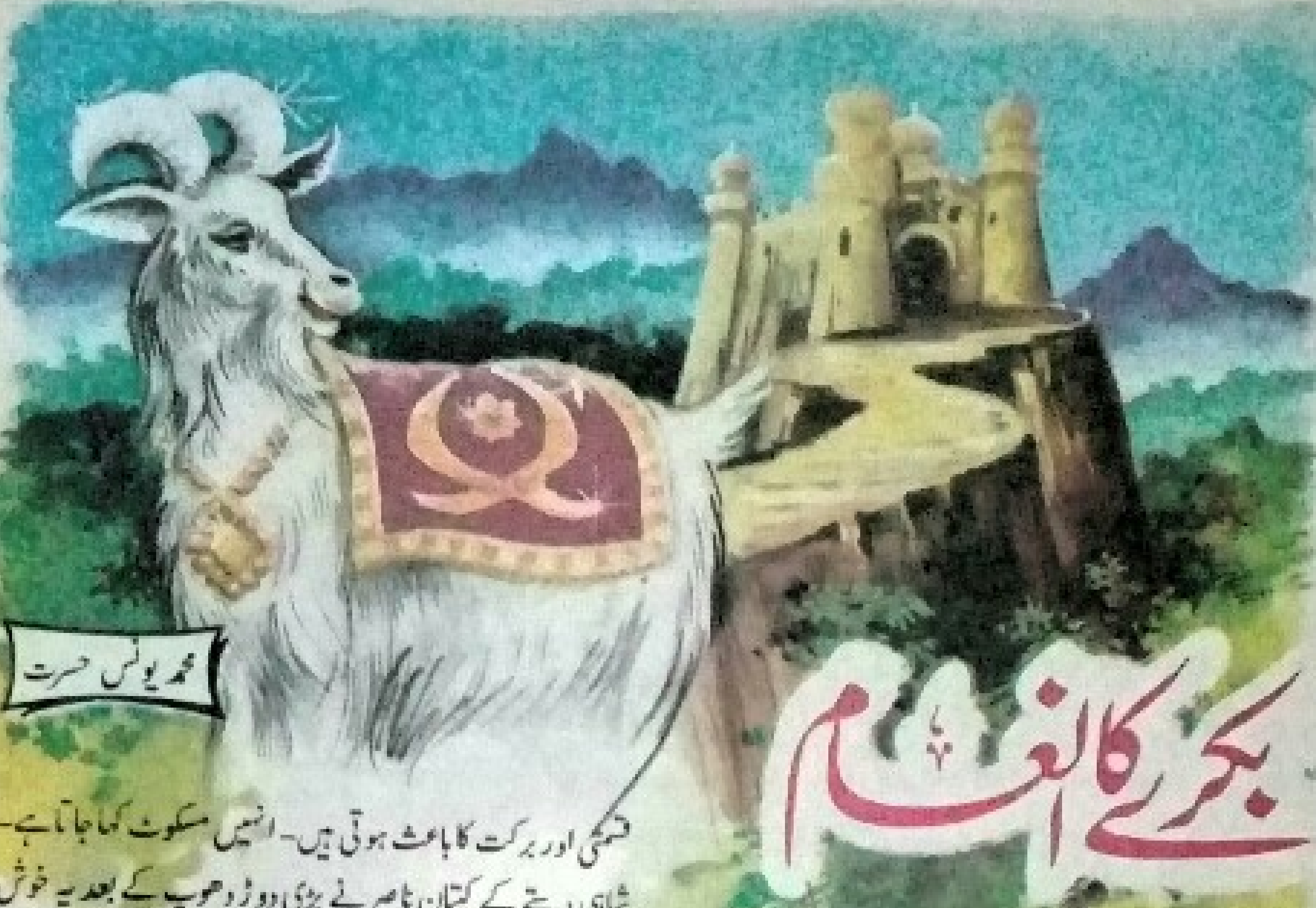

بکرے کا انعام

محمد یونس حسرت

یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی سلطنت اوشانیا کا قصہ ہے' جس پر شاہ ہمایوں بخت کی حکومت تھی۔ شاہ ہمایوں بخت کا قلعہ نما محل ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس قلعے کی فصیل کے بالکل ساتھ ایک ڈھلوان تھی جو نیچے جا کر ایک کھڈ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

یہ شاہ ہمایوں بخت کی سال گرہ کا دن تھا۔ خاص شاہی دستہ جو محل میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا' صبح ہی سے اپنی سرخ اور سنہری وردیوں میں ملبوس چاق چوبند کھڑا تھا۔ دستے کا ہر سپاہی بندوق سنبھالے چست انداز میں کھڑا بادشاہ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دستے کا کپتان ناصر سب سے آگے کھڑا تھا۔ اس کی وردی بھی سرخ اور سنہری تھی اور اس کے سینے پر بے شمار سونے چاندی کے تمغے سجے ہوئے تھے اور کپتان ناصر کے ساتھ عنبری کھڑا تھا۔

عنبری ایک ڈاڑھی والا بکرا تھا جو حال ہی میں شاہی دستے میں شامل ہوا تھا۔ یہ بکرا ان چیزوں میں سے ایک تھا جن کے متعلق سلطنت اوشانیا میں عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ وہ خوش قسمتی اور برکت کا باعث ہوتی ہیں۔ انہیں مسکوٹ کہا جاتا ہے۔ شاہی دستے کے کپتان ناصر نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد یہ خوش قسمت بکرا اپنے دستے کے لیے حاصل کیا تھا۔ اس بکرے پر کپتان ناصر ہی کو نہیں' شاہی دستے کے ایک ایک سپاہی کو فخر تھا کیونکہ یہ بکرا اپنے بھاری جسم اور خوبصورت سینگوں اور گھنی ڈاڑھی کی وجہ سے ویسے بھی دیکھنے کی چیز تھا۔ وہ بینڈ کی دھن پر بڑے شان دار انداز میں قدم اٹھاتا ہوا چلتا تھا۔

شاہ ہمایوں بخت کی سالگرہ کے جشن کے لیے عنبری کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ اس کے چاروں کھروں پر شاہی نشانات کے دونوں رنگ سرخ اور سنہری بڑی نفاست سے پھیرے گئے تھے۔ اس کی ڈاڑھی میں کنگھی کر کے سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس کے سینگوں پر چاندی جیسا سفید اور چمک دار روغن پھیرا گیا تھا اور اس کی پیٹھ پر سنہری زربفت کی نئی جھالردار چادر ڈالی گئی تھی۔ اس چادر پر سلطنت اوشانیا کا امتیازی نشان کڑھا ہوا تھا۔

عنبری کے پیچھے شاہی بینڈ باجے کا دستہ تھا۔ اس دستے کے نوعمر لڑکے بھی شان دار سرخ اور سنہری وردیاں پہنے بادشاہ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

پھر چوب دار نے بلند آواز میں تین بار ہانک لگائی۔

"با ادب! باملاحظہ! ہوشیار!" اور کہا "شہنشاہ عالم پناہ، خسرو مملکت اوشبانیا، شاہ ہمایوں بخت تشریف لاتے ہیں!"

اس آواز کے ساتھ ہی بگل بجے، شاہی بینڈ باجے نے سلطنت اوشبانیا کے قومی ترانے کی دھن بجانا شروع کی اور عنبری اس دھن کو سن کر باادب اور سر اوپر کی طرف اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

پھر شاہ ہمایوں بخت محل سے برآمد ہوا۔ اس نے نیا سرخ لباس پہن رکھا تھا اور اس پر سنہری جھالریں لگی تھیں۔ ہیرے جواہرات سے جگ مگ کرتا تاج بادشاہ کے سر پر سجا تھا۔ اس کے ساتھ ملکہ اور دوسرے امیر وزیر تھے۔ جیسے ہی بادشاہ قریب آیا، شاہی دستے نے کپتان ناصر کا اشارہ پا کر بادشاہ کو سلامی دی۔

بادشاہ کی نظر عنبری پر پڑی تو ایک دم اس کے قدم رک گئے اور وہ کپتان ناصر سے مخاطب ہوا۔ "ارے یہ کیا ہے؟ کپتان"

کپتان جھک کر آداب بجا لایا اور کہنے لگا "یہ عنبری ہے عالی جاہ، ہمارا نیا مسکوٹ۔ یہ خاص الخاص مسکوٹ میں نے خاص طور پر حضور کے لیے حاصل کیا ہے۔ یہ اب تک جہاں بھی رہا ہے، خوش قسمتی کا باعث بنتا رہا ہے"۔

"خوب، خوب!" شاہ ہمایوں بخت نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کپتان ناصر خوش ہو کر عنبری سے مخاطب ہوا "عنبری! بادشاہ سلامت کی خدمت میں آداب بجا لاؤ!"

عنبری نے فوری طور پر کپتان ناصر کے حکم پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک سکتا، اس نے اپنا سر نیچا کیا اور سیدھا شاہ ہمایوں بخت کی طرف لپکا۔ اس نے ایک پورے زور کی ٹکر بادشاہ کو ماری اور اسے ہوا میں اچھال دیا۔ اور پلک جھپکنے میں ہی شاہ ہمایوں قلعے کی فصیل پر سے ہوتا ہوا نظروں سے غائب ہو گیا۔

"اوہ، اوہ" ملکہ نے کہا، بادشاہ سلامت کا نیا لباس خراب ہو جائے گا اور ڈھلوان پر سے گرتے ہوئے شاید وہ زخمی بھی ہو جائیں۔ ارے دوڑو! جلدی کرو!"

شاہی دستہ خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ جس بکرے کو وہ خوش قسمتی کی خاطر لائے تھے، اب وہی ان کے لیے مصیبت کا پیغام لے کر آیا تھا۔ کپتان ناصر کی ٹانگیں بری طرح کپکپا رہی تھیں اور اسے قلعے کے نیچے بنے ہوئے خوفناک قید خانے کا خیال ڈرا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سارا الزام اسی کی ذات پر آئے گا اور بادشاہ اسے یا تو جان سے مروا ڈالے گا یا قید خانے میں پھنکوا دے گا جہاں وہ ساری عمر پڑا رہے گا۔

تاہم اس نے حوصلے سے کام لیا۔ اور سپاہیوں کو حکم دیا "ارے جلدی کرو! سیڑھیاں اور رسے لاؤ، فصیل کے ساتھ سیڑھیاں لگاؤ!"

سپاہی جلدی سے فصیل کی طرف لپکے اور فصیل پر چڑھ کر انہوں نے نیچے ڈھلوانی گھاٹی کی طرف نگاہ کی۔ ملکہ بھی ہوش کے عالم میں فصیل پر چڑھ آئی اور نیچے جھانکنے لگی اور پھر اس نے سپاہیوں کو متوجہ کیا "ارے وہ دیکھو وہ رہے بادشاہ سلامت! وہ دیکھو! اس درخت کے قریب دیکھو!"

سپاہی فوراً فصیل سے اترے اور اپنے ہاتھوں پیروں پر چلتے ہوئے ڈھلوان پر اترنے لگے۔ بادشاہ سلامت کو اس ناگہانی مصیبت سے چھٹکارا دلانے کی کوشش میں انہیں اپنی وردیوں کو خراب ہونے سے بچانے کا کوئی خیال نہیں رہا تھا۔

ڈھلوانی گھاٹی کا تقریباً آدھا راستہ طے کرنے کے بعد سپاہیوں نے شاہ ہمایوں بخت کو دیکھا۔ اس کے لبے چغے کا پچھلا حصہ گھاٹی میں اگے ہوئے ایک درخت کی شاخ میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کا تاج سر سے سرک کر ایک کان پر آگیا تھا۔ اس کی سنہری صدری ایک جگہ سے بری طرح پھٹ گئی تھی۔

کپتان ناصر جلدی سے اس کی طرف بڑھا "عالی جاہ! عالی جاہ! آپ کو چوٹ تو نہیں آئی عالی جاہ؟"

شاہ ہمایوں بخت نے کپتان ناصر کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ بری طرح مصروف تھا۔ ڈھلوان پر اگی ہوئی بیلوں سے وہ درجنوں سرخ سرخ رس بھریاں توڑ توڑ کر اپنے منہ میں ٹھونستا جا رہا تھا۔

"رس بھریاں! جنگلی رس بھریاں!" اس نے انگلیاں چاٹتے ہوئے کہا

"کیا مزے دار ہیں یہ جنگلی رس بھریاں!"

اور یہ کہتے ہوئے شاہ ہمایوں بخت نے اپنی انگلیاں اپنے نئے لباس ہی سے پونچھ ڈالیں۔

سپاہیوں نے قلعے کی فصیل سے ایک لمبی سی سیڑھی نیچے ڈھلوانی گھاٹی میں لٹکا دی تھی۔ لیکن شاہ ہمایوں بخت تھا کہ رس بھریوں کو چھوڑ کر سیڑھی کی طرف بڑھتا ہی نہیں تھا۔ وہ صرف اس وقت سیڑھی چڑھنے پر آمادہ ہوا جب کپتان نے اپنے دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ رس بھریاں توڑ توڑ کر اپنی جیبوں میں بھر لیں اور پھر قلعے میں لے آئیں۔

جب بادشاہ حفاظت کے ساتھ واپس قلعے میں پہنچ گیا تو ملکہ بادشاہ کا لباس دیکھ کر غصے میں آ گئی۔ "آپ نے اپنے نئے اور بہترین لباس کا ناس مار کر رکھ دیا ہے۔ اس پر جگہ جگہ رس بھریوں کے داغ لگا دیے ہیں"۔

کپتان ناصر نے کانپتے ہوئے شاہ ہمایوں بخت کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "عالی جاہ! اس افسوس ناک سانحہ پر ہماری جاں بخشی کر دیں۔ ہم اس بکرے کو فوراً اپنے دستے سے نکال دیں گے اور سزا کے طور پر اسے کسی قصاب کے حوالے کر دیا جائے گا"۔

"سزا!" شاہ ہمایوں بخت نے قریب کھڑے ہوئے سپاہی کی لباب بھری ہوئی جیب سے مٹھی بھر رس بھریاں نکالتے ہوئے کہا "کیا تمھیں یہ خیال نہیں آتا کہ ہم سال ہا سال سے اس شاہی محل میں رہ رہے ہیں اور کسی کو آج تک اس بات کا پتا نہیں چلا کہ فصیل کے نیچے کی ڈھلوان پر جنگلی رس بھریاں اگی ہوئی ہیں؟ تم سزا کی بات کر رہے ہو۔ اس دریافت کی خوشی میں عنبری کو سونے کا تمغہ دیا جائے گا"۔

اور ایسا ہی ہوا۔ اسی وقت شاہی جوہریوں کو ایک بڑا سا تمغہ تیار کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ تمغہ اتنا بڑا تھا کہ اتنا بڑا تمغہ سلطنت اوشانیا میں پہلے کبھی تیار نہیں ہوا تھا۔ یہ خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک طرف ایک جنگلی رس بھری کی تصویر بنائی گئی تھی اور دوسری طرف سلطنت اوشانیا کا امتیازی نشان کندہ ہوا تھا۔

اور اس کے بعد جب بھی کبھی محل میں کوئی تقریب ہوتی تو عنبری وہ سونے کا تمغہ گلے میں ڈالے فخر سے شاہی دستے کے آگے بینڈ کی دھن پر قدم اٹھاتے ہوئے ایک ٹھاٹھ دار انداز سے چلتا۔ اور اس دن کے بعد ہر صبح شاہ ہمایوں بخت کے ناشتے میں ایک پلیٹ جنگلی رس بھریوں سے لبالب بھری ہوئی موجود ہوتی۔ عنبری واقعی اس کے لیے خوش قسمتی کا باعث ثابت ہوا تھا۔

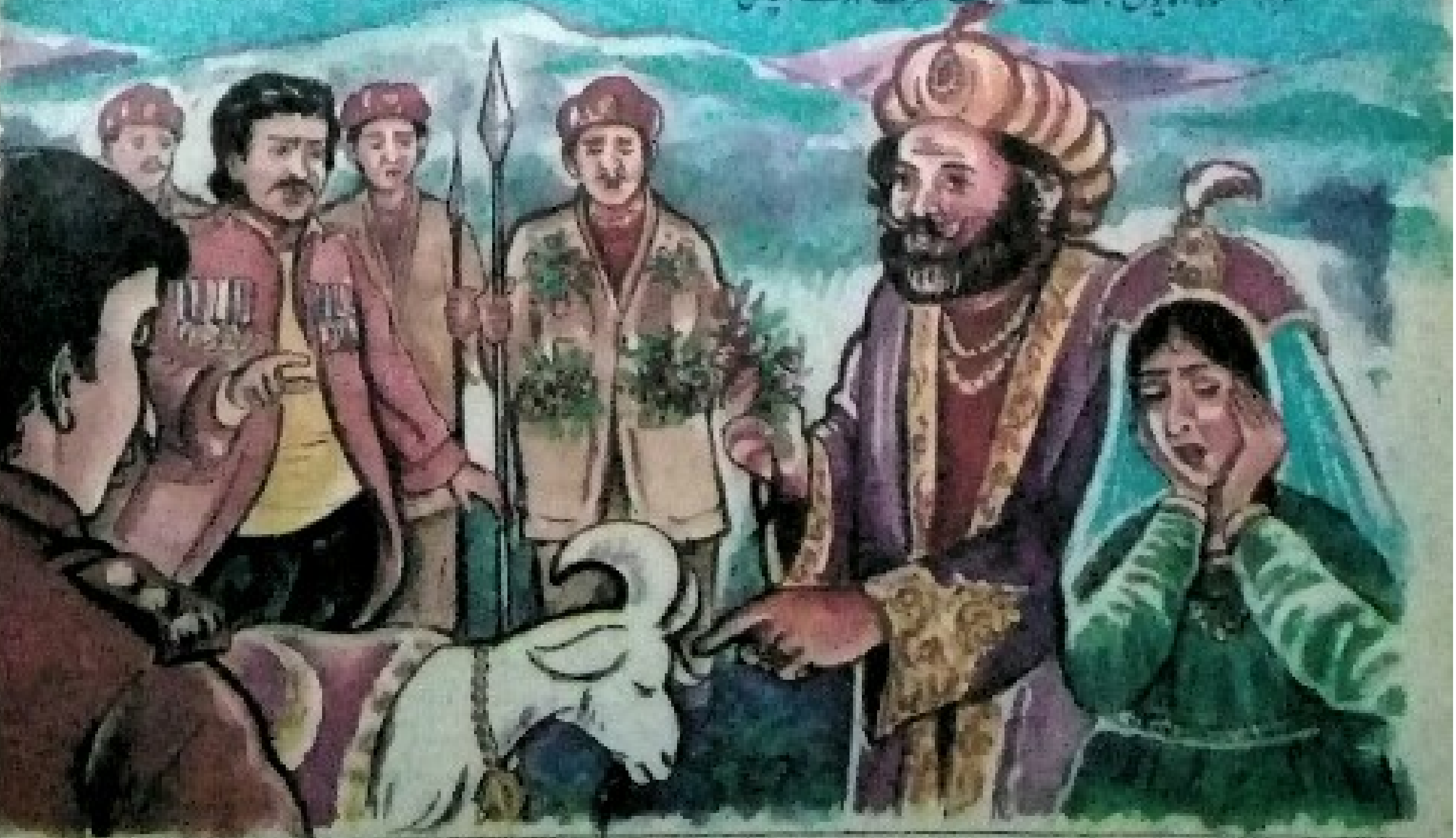

حنا خیری

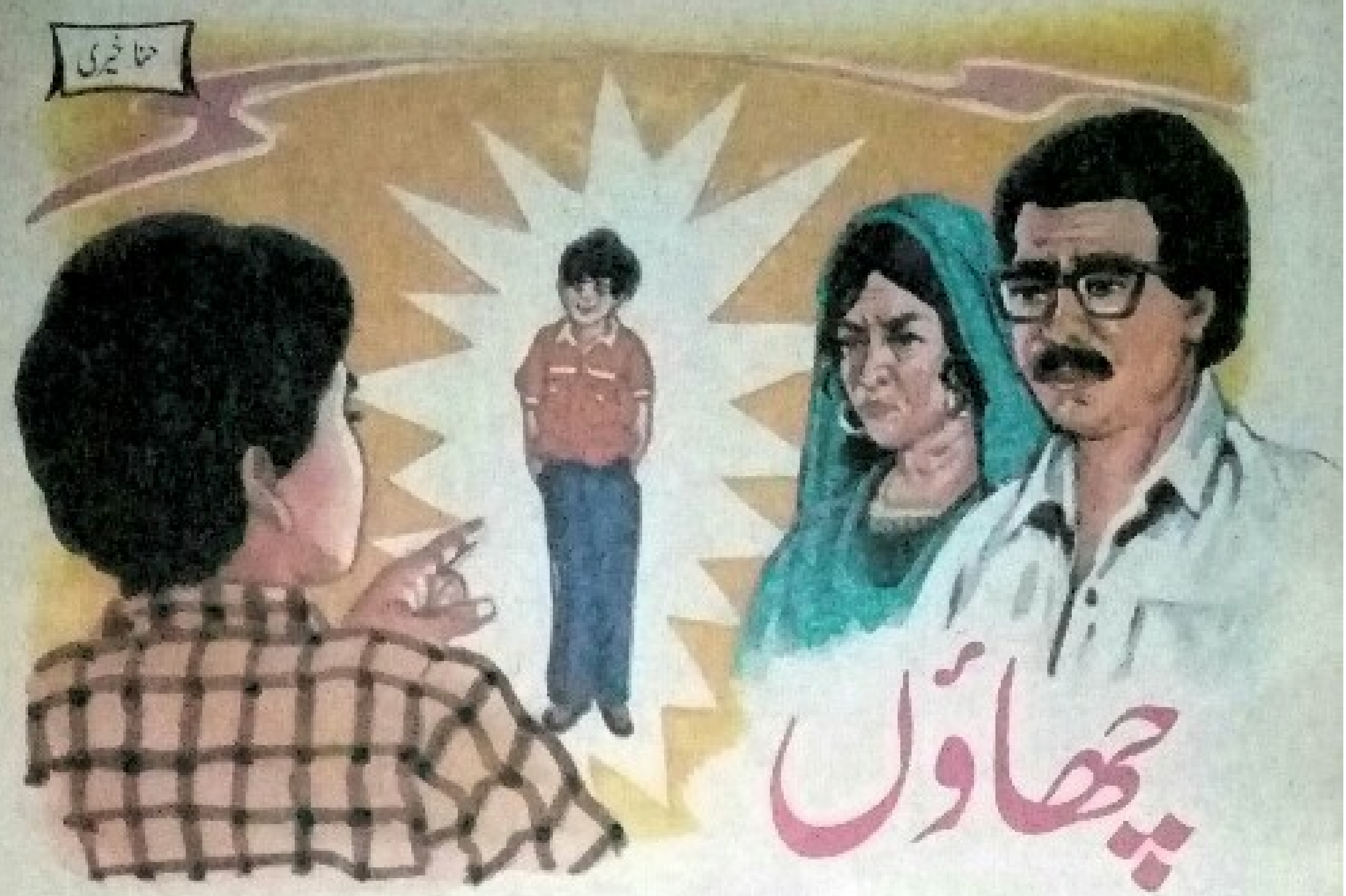

چھاؤں

کل ندیم اور خالہ جان آرہے ہیں۔ اس سال یہ ان کا دوسرا چکر ہے۔ جہاں ان کے آنے کی مجھے خوشی ہے وہاں یہ خیال بھی ذہن میں گردش کر رہا ہے کہ کاش وہ نہ آئیں۔ ہمیشہ کی طرح یہاں آکے، سب کے ساتھ اچھا وقت گزار کے وہ لوگ تو خوش باش یہاں سے لوٹیں گے اور میں.... میرا سکون پھر غارت ہو جائے گا۔ اتنی مشکلوں سے تو میں نے اپنے جذبات کو قابو کیا تھا، تھپک تھپک کے سلایا تھا۔ اب پھر انہیں دیکھ کر میری آرزوئیں، میری تمنائیں جاگ اٹھیں گی۔

ندیم میرا چھوٹا بھائی ہے۔ مجھ سے صرف ڈیڑھ برس ہی چھوٹا۔ مجھ سے بڑی روبی آپا ہیں۔ میری خالہ اور چچا کی آپس میں شادی ہوئی اور اس طرح میرے چچا میرے خالو بن گئے اور میری خالہ میری چچی۔ خالو کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں پیدا ہوا تو خالو کو اپنے بے اولاد ہونے کا بڑا غم تھا۔ میری امی اور ابو نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اب ان کی جو بھی اولاد ہو گی اسے وہ انہیں دے دیں گے اور پھر کبھی واپس نہ لیں گے۔ لہٰذا جب ندیم پیدا ہوا تو امی اور ابا نے اسے خالہ کی گود میں دے دیا۔

خالہ اور چاچو ندیم کو سال میں ایک دو بار ضرور ہمارے پاس بھیج دیتے ہیں۔ ندیم بھی جانتا ہے کہ وہ خالہ کا اپنا بیٹا نہیں بلکہ بھانجا ہے اور وہ امی ابو کو بڑی امی اور بڑے ابو کہتا ہے۔ امی، ابو اکثر اس ہی کی باتیں کرتے ہیں، اسے یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے بے شک اسے دوسروں کو دے دیا ہے لیکن ہے تو ان کی اولاد۔ پیار تو وہ اسے ایسا ہی کرتے ہیں جیسا مجھ سے اور آپا سے بلکہ بعض مرتبہ تو مجھے لگتا ہے کہ وہ اسے زیادہ ہی چاہتے ہیں۔

ندیم کو گئے چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ آپا کی شادی کی تاریخ ٹھہر گئی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ نہ آئیں۔ چاچو اپنے کاروبار کے سلسلے میں خاصے مصروف تھے اس لیے انہوں نے کہلوا دیا تھا کہ وہ شادی سے ایک روز پہلے ہی آئیں گے البتہ خالہ جان اور ندیم کو انہوں نے پہلے ہی بھیج دیا۔ شادی کی تیاریاں مکمل تھیں۔ ہم لوگ زیادہ خوش حال نہ تھے۔ بس گزر اوقات ہو جاتی تھی۔ امی نے اپنی سلیقہ شعاری سے جوڑ جوڑ کے آپا کا جہیز تیار کر رکھا تھا۔ کچھ ابو نے قرض وغیرہ لے لیا تھا لہٰذا یہ مسائل بھی نمٹ گئے۔ خالہ آپا کے لئے دو سونے کے سیٹ لائیں۔ ایک

ندیم کی طرف سے اور دوسرا اپنی اور چچا کی طرف سے۔

ہر مرتبہ جب ندیم آتا تو سب کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتا۔ میرے لئے بھی کبھی کوئی گیم' کبھی کرکٹ کا بلا' کبھی پتلون کا کپڑا' کبھی کہانیوں کی کتابیں' کبھی قیمتی قلم وغیرہ۔۔۔۔ خالہ کے مالی حالات ہمارے مقابلے میں بہت اچھے ہیں اور ان کا شمار اچھے کھاتے پیتے بلکہ میں تو کہوں گا امیر لوگوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ندیم کے پاس آسائش کی ہر چیز موجود ہے۔ میں لاہور صرف ایک بار گیا تھا البتہ ندیم ہمارے ہاں ہر سال آتا ہے۔ جب میں وہاں گیا تو خالہ کا گھر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اتنا بڑا گھر میں نے تو خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنے سارے کمرے' قیمتی فرنیچر' آرائش کی چیزیں۔ ندیم کا کمرا دیکھ کر بھی میں مبہوت کھڑا رہ گیا تھا۔ کیا تھا جو اس کے کمرے میں نہ ہو۔ اس کا الگ ٹی وی بھی تھا' کمپیوٹر بھی۔ جس پر وہ مزے مزے کے کھیل کھیلتا تھا۔ نرم قالین بھی' بہترین کتابیں' مختلف کھیل کی چیزیں' اعلیٰ قسموں کے کپڑوں سے بھری الماری اور وہ سب کچھ جس کی کوئی تمنا کر سکتا ہے۔ ندیم کی باتیں' اس کے قصے سن کر' اس کی چیزیں دیکھ کر اور وہ تحائف وصول کر کے جو وہ ہم سب کے لئے لاتا تھا میں تو پہلے ہی اس سے مرعوب تھا۔ اب اس کا شاندار گھر اور کمرا دیکھ کر تو بالکل گنگ ہو گیا تھا۔ اپنی کم مائیگی کا احساس پوری طرح اس روز مجھے ہوا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ندیم اپنی بڑائی ظاہر کرنے کو اور بڑ ہانکنے کو ایسی باتیں کرتا ہو بلکہ یہی اس کی زندگی تھی یہی اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا للذا ظاہر ہے وہ یہی باتیں کرتا۔

کبھی کبھی میں غیر شعوری طور پر اپنا اور ندیم کا موازنہ کرنے لگتا۔ ہر چیز میں اسے اپنے سے بہتر ہی پاتا۔ جب بھی ندیم ہمارے لئے تحفے لاتا' میں گنگ سا کھڑا سوچتا رہ جاتا کہ آخر میں اسے کیا دے سکتا ہوں۔ جو بھی کچھ اسے دوں گا وہ تو اس کے پاس پہلے ہی سے ہو گا۔ روبی آپا کے لئے ندیم سونے کا سیٹ لایا تو مجھے اپنی کم مائیگی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ میں اس سے بڑا تھا اور میں بھلا انہیں کیا دے رہا تھا۔ ایک معمولی سا ٹائم پیس' جس کے لئے میں نے بڑا جوڑ جوڑ کے پیسے جمع کئے تھے۔ یہ ٹائم پیس آپا کو دیتے ہوئے میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور میری آواز بھرا گئی۔ آپا سمجھیں کہ میں ان سے جدائی کے تصور سے اداس ہوں۔ مجھے بڑا گلے لگا کر پیار کیا اور کہا جہلم کون سا اتنی دور ہے وہ آتی جاتی رہا کریں گی اور یہ کہ میں امی' ابو کا خیال رکھوں۔ میرا تحفہ انہیں بہت پسند آیا۔ جب کہ میں سوچ رہا تھا کہ وہ میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہیں۔ آپا رخصت ہو کے جہلم سے سسرال چلی گئیں۔ خالہ' چاچو اور ندیم بھی ایک دو روز میں چلے گئے تو گھر میں سناٹا چھا گیا۔ ندیم گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ مگر نہیں سکون کہاں تھا بھلا۔۔۔۔ رہ رہ کے اس کے عمدہ اور نفیس لباس' قیمتی چیزیں اور ہمارے لئے لائے گئے قیمتی اور اعلیٰ تحفے میری آنکھوں کے سامنے پھرتے۔

میرے دل میں یہ خواہش سر اٹھانے لگتی کہ کاش ندیم کی بجائے امی نے مجھے خالہ کو دے دیا ہوتا تو آج میں آسائش سے پر زندگی گزار رہا ہوتا۔ یہ خیال میرے دل میں شدت پکڑنے لگتا اور مجھے لگتا کہ میرے ماں باپ نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ندیم سے پہلے تو میں دنیا میں آیا تھا اگر کسی کا ان آسائشوں پر حق بنتا تھا تو میرا بنتا تھا۔ انہی دنوں میں امی ابو نے خالہ اور چاچو سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی اولاد وہ انہیں دے دیں گے۔ کیا تھا اگر وہ مجھے ہی ان کی گود میں ڈال دیتے تو آج میرے پاس بھی یہ سب کچھ ہوتا۔

چند دنوں سے کمپیوٹر حاصل کرنے کی خواہش روز بروز میرے دل میں جڑ پکڑنے لگی تھی۔ جب سے میں نے ندیم کا کمپیوٹر دیکھا تھا تو میں شدت سے اس بات کا خواہش مند ہو گیا کہ میرے پاس بھی کمپیوٹر ہو۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔ میں نے کچھ بھی نہ سوچا۔۔۔۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میرے ماں باپ اتنی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپا کی شادی کے لئے انہیں قرض لینا پڑا تھا۔ بس میں نے اپنا دست سوال ان کے سامنے پھیلا دیا۔

"کیا کمپیوٹر" امی ہکا بکا رہ گئیں۔

"مگر بیٹا ہم کمپیوٹر کہاں سے لا سکتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو' ہماری اتنی حیثیت نہیں"۔

"کیوں؟ لا کیوں نہیں سکتے" میری آنکھوں پہ پردے پڑے ہوئے تھے۔

"بیٹا! ابھی روبی کی شادی کے لئے تمہارے ابو نے قرضہ لیا تھا وہ واپس کرنا ہے۔ پھر تمہیں معلوم ہے ہر دوسرے تیسرے مہینے زمین کی قسطیں جاتی ہیں"۔

"میں کچھ نہیں جانتا" میں بپھر اٹھا۔

"پہلی دفعہ کسی چیز کی خواہش کی ہے تو وہ بھی آپ لوگ دے نہیں سکتے ---- آخر ندیم بھی تو ہے۔ اسے تو ہر چیز میسر ہے۔ جو چاہتا ہے مل جاتا ہے"۔

"بیٹے ان کا ہمارا کیا مقابلہ ---- تمہارے چچا کے پاس بڑا پیسہ ہے"۔

"آخر کیوں ---- آپ نے کیوں ندیم کو انہیں دیا" میں چیخ اٹھا۔ "میں بھی تو تھا۔ آج مجھے آپ نے انہیں دیا ہوتا تو میں بھی خوب عیش کر رہا ہوتا۔ جو مزے ندیم کر رہا ہے وہ میں کر رہا ہوتا" یہ کہ کر میں امی کے چہرے پہ اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر باہر نکل آیا۔ اتنی بڑی بات میں نے اتنی آسانی سے کہ دی اور امی کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کو نظر انداز کر دیا۔

کئی گھنٹے میں گھر سے باہر رہا۔ بے مقصد آوارہ گردی کرتا رہا۔ پارک میں بیٹھا رہا۔ میرے اندر ایک عجیب سا لاوا پک رہا تھا۔ رہ رہ کر مجھے یہی احساس ہو رہا تھا کہ میرے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔ ندیم جن آسائشوں کے مزے لوٹ رہا تھا ان پہ مجھے اپنا حق نظر آ رہا تھا۔ کئی گھنٹے گزر گئے اور گزرتے وقت نے میرے اندر کے لاوے کو ٹھنڈا کر دیا۔ رات گئے جب میں گھر لوٹا اور اپنے بستر پر ڈھے گیا تو میرا جسم تپ رہا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ رات میں دو ایک بار جب بھی آنکھ کھلی تو میں نے امی ابو کو اپنے سرہانے دیکھا۔ ان کے چہروں سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید میرا بخار خاصا تیز تھا۔ امی نے مجھے دوا کھانے کو دی۔ ساتھ میں گرم گرم دودھ۔ میں دوا اور دودھ پی کر پھر مدہوش ہو گیا۔

صبح فجر کے وقت آنکھ کھلی۔ امی ابو تو ویسے بھی اس وقت اٹھ ہی جایا کرتے تھے۔ ان کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں دبے پاؤں جا کر کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا اور جھانک کے دیکھا۔ وہ دونوں تخت پر بیٹھے صبح کی چائے پی رہے تھے۔ ابو کے سامنے آج کا اخبار کھلا پڑا تھا۔

"شکر ہے اب زاہد کا بخار کچھ کم ہے" امی کی آواز آئی" میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ رات آیا بھی اتنی دیر سے"۔

"ہاں شکر ہے اب بہتر ہے طبیعت" ابو بولے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد امی بولیں "تو پھر کچھ سوچا آپ نے اس بارے میں"۔

"ہاں" ابو سر ہلا کر بولے۔

"یہی سوچ رہا ہوں۔ نجانے زاہد کے دل میں یہ خیال کیوں کر پیدا ہوا کہ ہمیں اس کا خیال نہیں یا ہم اس سے محبت نہیں کرتے۔ بہرحال مجھ سے جو ہو سکا میں کروں گا"۔

"لیکن ابھی تو روبی کی شادی پہ لیا گیا قرضہ بھی ادا کرنا ہے" امی نے کہا۔

"ہاں --- اس کا بھی اللہ کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گا" ابو نے ایک لمبی سی آہ بھری۔ "فی الحال تو میں یہ کرتا ہوں کہ اپنا کلیم منسوخ کر دینے کا خط لکھ دیتا ہوں کہ اب تک کی ادا کردہ رقم مجھے واپس کر دی جائے۔ مکان ویسے بھی ہم جیسوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ زمین کی اگلی قسطیں تو اب ویسے بھی ادا کرنا مشکل لگ رہا ہے"۔

"ہاں یہ تو ہے" امی دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھ کے کہنے لگیں۔ ہم جیسے لوگوں کے سروں پہ بس ایک چھت چاہیے۔ چاہے کرائے کی ہی ہو۔ زمین کا کسی نہ کسی طرح ہو بھی جاتا تو مکان بنانے کا پیسا کہاں سے آتا --- ایسے خواب دیکھنا شاید ہمیں زیب نہیں دیتا"۔

اس سے زیادہ میں نہیں سن سکا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بستر پہ آ کے بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں پہ پڑے پردے آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔

اف یہ میں نے کیا کیا' میرا دل چاہا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ میں نے اپنے چاہنے والے' جان نچھاور کرنے والے ماں باپ کو کتنا دکھ دیا۔ انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ مجھے پروان چڑھایا۔ اپنی بساط سے بڑھ کر میرا ہر طرح خیال کیا اور میں نے کتنی گھٹیا حرکت کی۔ بجائے اس کے کہ میں ان کا سہارا بنوں۔ میں ان کے سر سے سائبان تک چھین رہا ہوں۔ ان کی محبتوں کو روپے پیسے کے ترازو میں تولا۔ ان سے اتنی بڑی بات کہی کہ مجھے ندیم کی جگہ دیا ہوتا تو میں آج عیش کر رہا ہوتا۔ گویا ان کی محبت۔ ان کی شفقت کچھ ہے ہی نہیں۔ ان کا دل کتنا دکھا ہو گا یہ بات سن کے --- اور ان کی پریشانیوں کا بھی خیال نہ کیا۔ وہ تو بمشکل زمین کی قسطیں دے رہے ہیں کہاں سے میری بے جا خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کو یہ بات کہہ کے اتنا مجبور کر دیا کہ وہ اگلی قسط میری خوشیوں کی خاطر قربان کرنے کو اور اپنے خواب مسمار کرنے کو تیار ہو گئے۔ آپا نے جاتے وقت مجھے کتنی نصیحت کی تھی کہ امی' ابو کا خیال رکھوں اور میں نے.... میں نے کتنی ذلیل اور گھٹیا بات کی۔ ان کا دل کٹ کے رہ گیا ہو گا یہ بات سن کے --- کاش کہ میں بولنے سے پہلے سوچ لیتا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ اس سے ان کی کتنی دل آزاری ہو گی"۔ میں زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ "اے اللہ تو مجھے معاف فرمانا۔ میں نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا --- اتنا بڑا گناہ کیا" میری ہچکیاں بندھنے لگیں۔

ابو تیار ہو کے دفتر جانے لگے تو میں تیر کی طرح کمرے سے نکلا "مجھے کچھ نہیں چاہیے"۔ میں ان کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ امی' ابو دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ میرا سر جھکا ہوا تھا "مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ لوگوں کا دل دکھایا۔ خواہشوں کا شیطان مجھ پہ حاوی آ گیا تھا۔ مجھے آپ کی شفقت اور محبت کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس میری یہی خواہش ہے کہ آپ مجھ سے خوش رہیں اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کی محبت سے بڑھ کر میرے لئے دنیا میں کچھ نہیں --- پلیز مجھے معاف کر دیں"۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا اور مجھے زمین آسمان سب گردش میں آتے دکھائی دے رہے تھے۔ ماں باپ کا دل دکھا کے میں نے شاید عرش کو ہلا ڈالا تھا۔ تھوڑی دیر میں اسی طرح روتا رہا۔ بار بار میرے منہ سے مجھے معاف کر دیں۔ کے الفاظ نکل رہے تھے۔ امی' ابو کے شفیق ہاتھوں کا لمس مجھے اپنے سر اور پیٹھ پہ محسوس ہوا اور جب انہوں نے مجھے شفقت سے تھپ تھپایا تو مجھے یوں لگا جیسے میں چلچلاتی' جھلساتی دھوپ سے یکایک ٹھنڈی' فرحت بخش' پرسکون چھاؤں میں آ گیا ہوں۔

بریف کیس

ف۔ عزیز

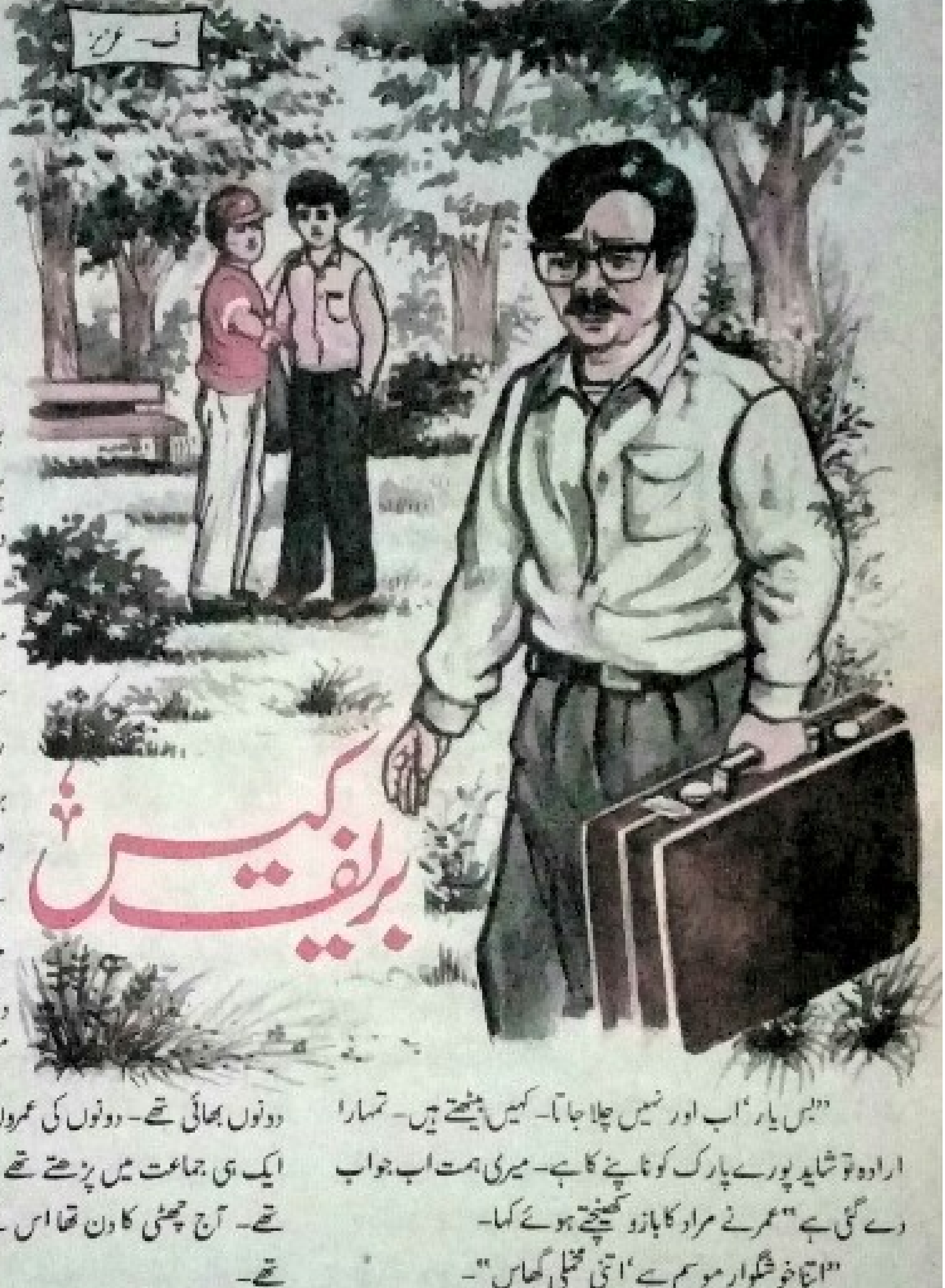

"بس یار، اب اور نہیں چلا جاتا۔ کہیں بیٹھتے ہیں۔ تمہارا ارادہ تو شاید پورے پارک کو ناپنے کا ہے۔ میری ہمت اب جواب دے گئی ہے" عمر نے مراد کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

"اتنا خوشگوار موسم ہے، اتنی مخملی گھاس"۔

"اسے دیکھ کر تمہارا دل اسے چرنے کو مچل رہا ہے" ابھی جملہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ عمر نے اچک کر مکمل کیا۔

"میرا تو محض اس پر چلنے کو دل چاہتا ہے البتہ تم جیسی مخلوق کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ تمہارا اسے چرنے کو دل چاہتا ہے یا اس پر کھڑے ہو کر دولتیاں جھاڑنے کو" مراد نے بدلا لیتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ بھی ہیں آپ ہی کے بھائی ہیں، چلو یہاں کے ریسٹورنٹ میں جا کر کچھ کھاتے ہیں۔ میرے پیٹ کے چوہے دوڑ دوڑ کر بے ہوش ہونے کے قریب ہیں" عمر نے کہا۔

"تھوڑی دیر یہاں بنچ پر بیٹھ کر آرام کر لیں پھر چلتے ہیں۔ واہ کتنا خوب صورت آسمان ہے۔ بالکل صاف اور نیلا" مراد نے بنچ پر سر ٹیک کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جاتی سردیوں کے دن تھے۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔ یہ شہر کا سب سے بڑا پارک تھا۔ جہاں ریسٹورنٹ بھی تھا اور کئی بڑے بڑے میدان تھے۔ آج کل ہر طرف بہار کی وجہ سے سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پھولوں کی بھرمار تھی۔ مراد کو قدرتی نظاروں سے بہت دل چسپی تھی۔ اس لیے وہ مسلسل پارک میں گھوم رہا تھا۔ وہ دونوں بھائی تھے۔ دونوں کی عمروں میں فرق بہت کم تھا۔ دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے اور دونوں بہت ذہین اور محنتی تھے۔ آج چھٹی کا دن تھا اس لیے دونوں تفریح کے لئے نکلے تھے۔

"آسمان کے بجائے زمین کی طرف بھی دیکھ لو" عمر نے مراد کو ہلاتے ہوئے کہا جو آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ذرا اس آدمی کو دیکھو وہ پارک میں بریف کیس پکڑ کر ٹہل رہا ہے" عمر نے تھوڑی دور ٹہلتے ہوئے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں اس کے بریف کیس پکڑنے پر کیا اعتراض ہے۔ شاید کوئی طالب علم ہو اور یہاں پڑھنے آیا ہو۔ اب تھکن

اتارنے کے لئے ٹہل رہا ہو گا" مراد نے تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔

اسے دیکھ کر مجھے تو فلمی اسمگلر یاد آ رہے ہیں۔ شاید ابھی دوسری طرف سے ایک اور آدمی بریف کیس سمیت برآمد ہو اور دونوں خفیہ الفاظ میں گفت گو کرنے کے بعد بریف کیس بدل کر چلتے بنیں" عمر نے پورا فلمی منظر سناتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے کہتا ہوں کہ فلمیں مت دیکھا کرو۔ یہ انہی کا اثر ہے۔ جب بھی کسی شخص کو بریف کیس پکڑے دیکھتے ہو تمہیں اسمگلر یاد آ جاتے ہیں۔ اس دن ابو کے کوئی دوست آئے تھے۔ ان پر بھی تم نے یہی شک کیا تھا۔ بلکہ تم تو پولیس کو فون کروانے پر مصر تھے۔ شکر ہے کہ ابو وقت پر آ گئے تھے"۔ مراد نے پچھلا واقعہ یاد کرواتے ہوئے کہا۔

"ویسے یار' مذاق کی بات نہیں اس کی شکل دیکھو" عمر نے اس کے چہرے کی طرف متوجہ کیا جہاں گھبراہٹ کے آثار خاصے واضح تھے اور اس کے ٹہلنے کے انداز سے بھی کافی بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"چلو' چل کر اس سے پوچھتے ہیں۔ شاید انہیں کوئی پریشانی ہو اور ہم اس کی مدد کر سکیں" مراد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یار اتنا ڈانٹ ہی نہ پڑ جائے" عمر نے خدشے کا اظہار کیا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ ہم کون سا کچھ مانگنے جا رہے ہیں" مراد نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ دونوں اس لڑکے کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے دوسری طرف مڑ چکا تھا۔ اس وقت اس کی پشت ان کی طرف تھی۔

"بھائی جان!" عمر نے قریب جا کر کندھے پر ہاتھ لگاتے ہوئے متوجہ کیا۔

"جی....." وہ اپنے دھیان میں تھا اس لئے ایک دم کندھا ہلانے سے بوکھلا گیا۔ "کیا بات ہے" جب اس نے نو عمر لڑکوں کو دیکھا تو اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔

"بھائی جان' ہم کافی دیر سے آپ کو دیکھ رہے تھے۔ آپ کچھ پریشان لگ رہے تھے۔ ہم نے سوچا پوچھ لیں شاید ہم آپ کی کوئی مدد کر سکیں؟" عمر نے مہذب لہجے میں کہا۔

"کیوں تم لوگوں کو اور کوئی کام نہیں۔ جو مجھے گھور رہے تھے۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ جاؤ کسی اور کی مدد کرو' بڑے آئے خدائی فوجدار......" اس نے کرخت لہجے میں کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔ "بڑا ہی بد اخلاق آدمی تھا" مراد نے کھسیانے لہجے میں کہا کیونکہ بات کرنے کا آئیڈیا اسی کا تھا۔

"اور کرو ہمدردی' مجھے تو شکل سے ہی مشکوک لگ رہا تھا" عمر نے غصے سے کہا "چلو چھوڑو' ہماری نیت نیک تھی۔ آگے اس کی اپنی مرضی۔ ہمیں کیا' آؤ کچھ کھانے چلتے ہیں"۔

"یار تم نے چینی کھانوں کا آرڈر دیا تھا کہیں بیرا انہیں لینے چین تو نہیں چلا گیا" عمر نے بے چینی سے کہا "لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ شکر ہے کہ ہم نے چینی کھانے مانگے ہیں اگر یورپی مانگتے تو اور زیادہ دیر لگتی۔ میں تو پانی پی پی کر مشکیزہ بن چکا ہوں" مراد نے ایک اور گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ پانی پیتے جاؤ۔ جونہی بیرا گلاس بھر کر جاتا ہے تم خالی کر دیتے ہو" عمر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"پہلے دو گلاس تو میں نے پیاس کے مارے پیے تھے۔ باقی دو گلاس مروت کے مارے پی لیے۔ کہیں بیرے بے چارے کا دل نہ ٹوٹ جائے اور اب میرا خیال ہے کھانا آنے تک میں ذرا ٹائلٹ سے ہو آؤں"۔

مراد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مراد جونہی ٹائلٹ کی طرف بڑھا ایک آدمی تیزی سے اس سے ٹکراتا ہوا چلا گیا۔ "ارے یہ تو وہی بدتمیز آدمی لگ رہا ہے۔ مراد نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے سوچا۔ وہ تیزی سے غائب ہو گیا تھا۔ مراد نے جونہی دروازہ کھولا سامنے بریف کیس پڑا نظر آیا۔ شاید وہ آدمی جلدی میں بھول گیا۔ مراد نے بریف کیس اٹھایا اور کھانے کے کمرے میں واپس آ گیا۔ "یہ کہاں سے اٹھا لائے ہو" عمر نے بریف کیس دیکھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

"جب میں اندر جا رہا تھا وہی بدتمیز آدمی تیزی سے بھاگتا ہوا گزرا تھا۔ میں اندر گیا تو یہ وہاں پڑا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ جلدی میں بھول گیا۔ اس لئے میں اٹھا لایا ہوں" مراد نے اسے

پاکستان گولڈن جوبلی 50 1947 - 1997

میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"دیکھو! اس پر تو گھڑی بھی بنی ہوئی ہے"۔ مراد نے ہندسوں کے درمیان چمکتے ہوئے ہندسوں کی طرف متوجہ کیا جو بدلتے جا رہے تھے۔ عمر نے بریف کیس کی طرف دیکھا اور اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ اس نے بریف کیس مراد کے ہاتھ سے چھینا اور باہر کی طرف بھاگتے ہوئے چلایا "سب لوگ زمین پر لیٹ جائیں۔ اس میں بم ہے۔ لوگ حیرت اور خوف سے اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ریسٹورنٹ سے تھوڑی دور ایک بہت بڑا میدان تھا جو اس وقت بالکل خالی تھا۔ عمر نے پوری قوت سے بریف کیس دور پھینکا اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر نیچے لیٹ گیا۔ زوردار دھماکا ہوا اور ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔

"ویسے یار! میرے تو سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ بم وہیں پھٹ جاتا تو کیا ہوتا" مراد نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"وہی ہوتا جو آئے روز ہوتا ہے۔ سینکڑوں بے گناہ مارے جاتے اور کچھ لوگوں کی تجوریاں بھر جاتیں" عمر نے کہا

"یار سمجھ میں نہیں آتا لوگ اتنے خود غرض کیسے ہو جاتے ہیں۔ محض دولت کی خاطر سینکڑوں لوگوں کی جان کی پروا نہیں کرتے۔ حال آں کہ ہر انسان کو اتنا ہی رزق ملتا ہے جتنا اس کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ اور یہ اللہ نے انسانوں پر چھوڑا ہے کہ وہ اسے حلال طریقے سے حاصل کرتے ہیں یا حرام سے"۔

"یہی تو بات ہے۔ اگر لوگ اس حقیقت کو سچے دل سے قبول کرلیں تو وہ ایسا کریں ہی کیوں۔ اب ہمیں جو انعام کی رقم ملی ہے وہ ہماری قسمت میں تھی۔ ہم نے حلال طریقے سے حاصل کی ہے۔ اس بم رکھنے والے کو جو پیسے ملے ہوں گے وہ بھی اس کی قسمت میں تھے۔ لیکن اس نے حرام طریقے سے حاصل کیے۔ دونوں طرف پیسوں کا ذریعہ تو وہ بریف کیس ہی بنا ہے۔ بس اگر حرام اور حلال کا فرق لوگوں کی سمجھ میں آجائے تو ہر طرف امن اور چین ہو جائے" عمر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تو تم لوگ امن چین کر لو" ابھی تمہارے زخم صحیح نہیں ہوئے" امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا جنھوں نے صرف آخری جملہ سنا تھا۔

"والدہ صاحبہ ' ہم تو قائداعظمؒ کے نظریے کام کام اور صرف کام کے قائل ہیں" مراد نے کہا۔

"میرے چاند' ذرا تم لوگ ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر تم سے کام کام اور بہت سے کام کرواؤں گی" امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مارے گئے" دونوں نے ہم آواز ہو کر کہا اور چادر سر تک تان کر لیٹ گئے۔

شہریار اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا ہم دم کا انتظار کر رہا تھا۔ موسم بہت پیارا تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ شہریار کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پارک کی سیر کرے۔ لیکن وہ اکیلا نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ پولیو نے اسے معذور بنا کر ہمیشہ کے لیے وہیل چیئر پر بیٹھا دیا تھا۔ ہم دم اس کا دوست بھی تھا اور مدد گار بھی' اے ایکس 999 سیریز کے اس روبوٹ کو اور کاموں کے علاوہ معذوروں کی خدمت کی خاص تربیت دی گئی تھی۔ ہم دم تقریباً دو سال سے شہریار کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ کمپنی نے تو اس کا نام ہیلپر رکھا تھا لیکن جب سے وہ شہریار کے ہاں آیا اس کا نام ہم دم پڑ گیا تھا۔ ہم دم کے دو کام خاص تھے۔ پہلا یہ کہ وہ شہریار کو اس کی وہیل چیئر پر بٹھا کر سیر کرانے لے جاتا تھا اور دوسرا یہ کہ شہریار سے دنیا بھر کی باتیں کرتا رہتا تھا۔

شہریار نے ایک دفعہ پھر بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ وہ اپنی ماں سے کچھ شکایت کرنے ہی والا تھا کہ ہم دم کی فلائنگ کار باہر لان میں آکر اتری۔ ہم دم جلدی سے کار سے باہر آیا اور یہ کہتا ہوا شہریار کی طرف دوڑا "معاف کرنا شہریار' مجھے تھوڑی دیر ہو گئی۔ اب فضا میں بھی اتنا ٹریفک ہو گیا ہے کہ آتے آتے دیر ہو جاتی ہے"۔

"کوئی بات نہیں۔ بس میں امی سے تمھاری شکایت کرنے ہی والا تھا کہ تم پہنچ گئے۔ تمھیں نیا سال مبارک ہو" شہریار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم دم نے بڑی گرم جوشی سے شہریار کا ہاتھ پکڑا اور بولا "ارے' ہاں! آج تو 2001ء کا پہلا دن ہے۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ تمھیں بھی مبارک ہو۔ شہریار' میری دعا ہے کہ یہ نیا سال تمھارے لیے پہلے سے بھی زیادہ بلند حوصلوں کا پیغام لے کر آئے اور اس سال تم پچھلے

برسوں سے بھی زیادہ بڑے کام کرو"۔

شہریار نے بھی ہم دم کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "مجھے نہیں پتا کہ میں نے کوئی بڑا کام کیا ہے۔ لیکن اگر واقعی کوئی بڑا کام کیا ہے تو اس میں آدھا حصہ تمہارا ہے"۔

"چھوڑو بھائی' ان تکلف کی باتوں کو۔ ہم روبوٹ لوگوں سے تو سیدھی سیدھی بات کیا کرو" ہم دم نے شہریار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

شہریار اپنی معذوری کی وجہ سے بڑا بجھا بجھا رہتا تھا۔ اسے کسی چیز سے دل چسپی نہیں تھی۔ ہم دم سے پہلے معذوروں کے ہسپتال کی ایک نرس دن میں تین گھنٹے کے لیے آتی اور شہریار کی دیکھ بھال کرتی۔ ہسپتال کے عملے کے اور لوگ بھی شہریار کے پاس آتے اور اس سے باتیں کرتے۔ اکثر وہ دوسرے مریضوں کے ساتھ سیر تفریح کے لیے بھی جاتا تھا جہاں ہسپتال کے ڈاکٹر اور دوسرے لوگ بھی ساتھ جاتے۔ لیکن نجانے کیوں شہریار کو کچھ مزا نہیں آتا تھا۔ وہ زیادہ خوش نہیں ہوتا تھا۔

پھر ایک دن شہریار کے ابو نے اسے بتایا کہ رئیل روبوٹس نامی کمپنی نے ایک ایسا روبوٹ بنایا ہے جو معذوروں کی نہ صرف دیکھ بھال کر سکتا ہے بلکہ ان کا دل بھی بہلاتا ہے۔ یہ روزانہ یا ہفتہ میں چند دن گھر آ سکتا ہے پھر انہوں نے شہریار سے پوچھا "کیا خیال ہے ہسپتال والوں کے بجائے اس روبوٹ کو نہ آزمایا جائے"۔

"ٹھیک ہے" شہریار نے بڑا چھوٹا سا جواب دیا اور سوچنے لگا "کیا روبوٹ میری بیماری دور کر دے گا؟ کیا میری معذوری ختم ہو جائے گی؟" وہ دل ہی دل میں اپنی اس سوچ پر ہنس دیا۔ اور پھر ایک دن اس کے ابو نے اس روبوٹ کی خدمات حاصل کر لیں۔

ہم دم سے بڑی جلدی شہریار کی دوستی ہو گئی۔ وہ بڑی اچھی اور کام کی باتیں کرتا تھا۔ ہم دم کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے پاس روبوٹ موسیقاروں کے بہت سے ریکارڈ تھے جو وہ شہریار کو سنواتا تھا۔ ہم دم نے شہریار کو گاما تھری نامی روبوٹ موسیقار کی بنائی ہوئی دھنوں کی ریکارڈنگ بھی سنوائی۔ یہ دھنیں مئی 1961ء میں ترتیب دی گئی تھیں اور انہیں پیرس کی ایک میوزک کانفرنس میں سنوایا گیا تھا جس میں انسانی برادری کے مشہور موسیقار' سائنس دان اور اخباری نمائندے موجود تھے۔ ان سب نے یہ موسیقی بہت پسند کی جو روبوٹ کی ترتیب دی ہوئی پہلی موسیقی تھی۔

اپنی برادری میں ہم دم کی واقفیت اور دوستی بہت زیادہ تھی۔ پارک میں اس کے بہت سے جاننے والے ملتے رہتے تھے جن کی ملاقات وہ شہریار سے بھی کراتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک روبوٹ کا تعارف کرایا "ان سے ملو۔ یہ شطرنج کے بہترین کھلاڑی ہیں۔ ان کا نہ کوئی روبوٹ مقابلہ کر سکتا ہے نہ انسان۔ شطرنج کھیلنے کے طریقے ان کے برقی دماغ میں ایسے بیٹھ گئے ہیں کہ یہ ہر چال چلنے سے پہلے آگے کی سات آٹھ چالوں کا خاکہ اپنے دماغ میں بنا لیتے ہیں"۔

ایک اور دن ہم دم نے شہریار کی ملاقات ایک روبوٹ سرجن سے کرائی "یہ دماغ کا آپریشن کرتے ہیں اور وہ بھی ریموٹ کنٹرول سے۔ یعنی مریض کہیں ہے اور سرجن کہیں۔" "واہ! واہ! کیا باریک کام ہے اور پھر کامیابی سو فی صد۔"

"سچ؟" شہریار کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کس دنیا میں رہ رہے ہو میاں؟ یہ سرجری تو ہماری برادری والے پچھلی صدی کے آخر سے کر رہے ہیں" ہم دم نے بڑے فخر سے کہا۔

شہریار کچھ شرمندہ سا ہو گیا کہ وہ روبوٹس کے بارے میں اتنا کم جانتا ہے۔ بہرحال رفتہ رفتہ وہ روبوٹس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا۔

ایک دن ہم دم شہریار کی وھیل چیئر دھکیلتے دھکیلتے پارک میں بہت دور تک چلا گیا اور پھر جھیل کے پاس رک گیا۔ شہریار جھیل میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں

اور تیرتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے میں مصروف تھا کہ ہم دم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "اوپن یونیورسٹی والے ایک مقابلہ کرا رہے ہیں مضمون نویسی کا' موضوع ہے: روبوٹ انسان کا دوست یا دشمن؟' یہ مقابلہ اقوام متحدہ اور یونیورسٹی کی طرف سے ہو گا اور اس میں صرف انسان حصہ لے سکیں گے۔ تم اس میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟"

"میں؟ تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ ایک معذور انسان کیا کر سکتا ہے؟" شہریار نے مایوسی سے کہا۔

"اگر تم میں ہمت ہے تو معذوری کوئی چیز نہیں۔ یہ انسان کے سوچنے کا انداز ہے جو اسے معذور یا صحت مند بناتا ہے۔ تم پڑھے لکھے اور ذہین ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔ میری مدد چاہیے تو میں حاضر ہوں"۔

اور پھر جب شہریار نے اس مقابلے میں حصہ لیا تو وہ واقعی کامیاب ہو گیا۔ اس کے مضمون کو بہت پسند کیا گیا اور اسے بہت بڑا انعام ملا۔

شہریار نے ہم دم کے اصرار پر خاص خاص کھیلوں میں بھی حصہ لینا شروع کیا اور وہ جسمانی طور پر بہتر محسوس کرنے لگا۔ لوگوں سے ملنے جلنے میں اسے جو گھبراہٹ اور جھجک محسوس ہوتی تھی وہ بھی ختم ہونے لگی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے جیسے ہی اقوام متحدہ اور اوپن یونیورسٹی کی طرف سے انعام لینے کے لیے جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تو وہ فوراً" راضی ہو گیا۔ وہ ہم دم کے ساتھ جلسہ میں پہنچا اور جب اسے تقریر کرنے کے لیے کہا گیا تو اسے جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے پہیّے پر لگے ہوئے بٹن کو دبایا اور بولنا شروع کر دیا۔ "میں اس وقت آپ سے وہی باتیں کروں گا جو میں نے اپنے مضمون میں لکھی ہیں۔ آدھی صدی سے پہلے کی بات ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے شہر گلاسگو میں ایک کانفرنس کے دوران میں بعض لوگوں نے یہ خطرہ ظاہر کیا تھا کہ 15 سال کے اندر انسان ان روبوٹس کا غلام بن جائے گا جنھیں اس نے خود بنایا ہے۔

آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ یہ خیال غلط تھا۔ اسی کانفرنس میں جاپان کے پروفیسر توشیو فوکودا نے خیال ظاہر کیا تھا کہ روبوٹ انسان کا دشمن نہیں بلکہ دوست ہے اور وہ انسان کے لیے خصوصاً" بیمار اور معذور انسانوں کے لیے مددگار ثابت ہو گا۔ پروفیسر فوکودا کی باتیں آج سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں معذور ہوں۔ کچھ دن پہلے تک مجھے اپنی معذوری کا بہت زیادہ احساس تھا۔ میری دیکھ بھال کرنے والے' مجھ سے ملنے جلنے والے' عزیز رشتہ دار' دوست سب مجھے بے چارا کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ معذور انسان کی ہمارے معاشرے میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ بس اس پر ترس کھا لینا کافی ہے۔ لیکن جب سے ہم دم روبوٹ نے میرے پاس آنا جانا شروع کیا میری حالت ہی بدل گئی۔ اس کی باتوں میں انسان کی طرح ترس کھانے کا انداز تو نہیں تھا البتہ اس کی باتوں نے مجھ میں اعتماد پیدا کر دیا۔ میں اپنی معذوری کو بھول گیا۔ میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ ہم دم نے میری اس طرح مدد کی کہ مجھے گھومنے پھرنے اور اپنے کام کرنے میں بہت سہولت ہو گئی۔ یہ مدد کا جذبہ ترس کھانے سے کہیں بہتر ہے۔

مختصر یہ کہ آج جب اکیسویں صدی آدھی گزر چکی ہے تو ہم اس جگہ آن پہنچے ہیں جہاں انسان انسان سے بس زبانی ہمدردی کرتا ہے۔ مجھے یہ ڈر تو نہیں ہے کہ روبوٹ جسے انسان نے بنایا ہے اسے اپنا غلام بنا لے گا۔ لیکن ہاں مجھے یہ ضرور دکھائی دے رہا ہے کہ انسان نے جس طرح اپنی ذہنی صلاحیت روبوٹ کے دماغ میں منتقل کی ہے اسی طرح کچھ دن میں وہ اپنے تمام جذبات جن کی وجہ سے وہ انسان کہلاتا ہے روبوٹ کے دل میں منتقل کر دے گا۔ بلکہ ہم دم کو دیکھ کر تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ کام شروع ہو چکا ہے۔

نجمہ معراج

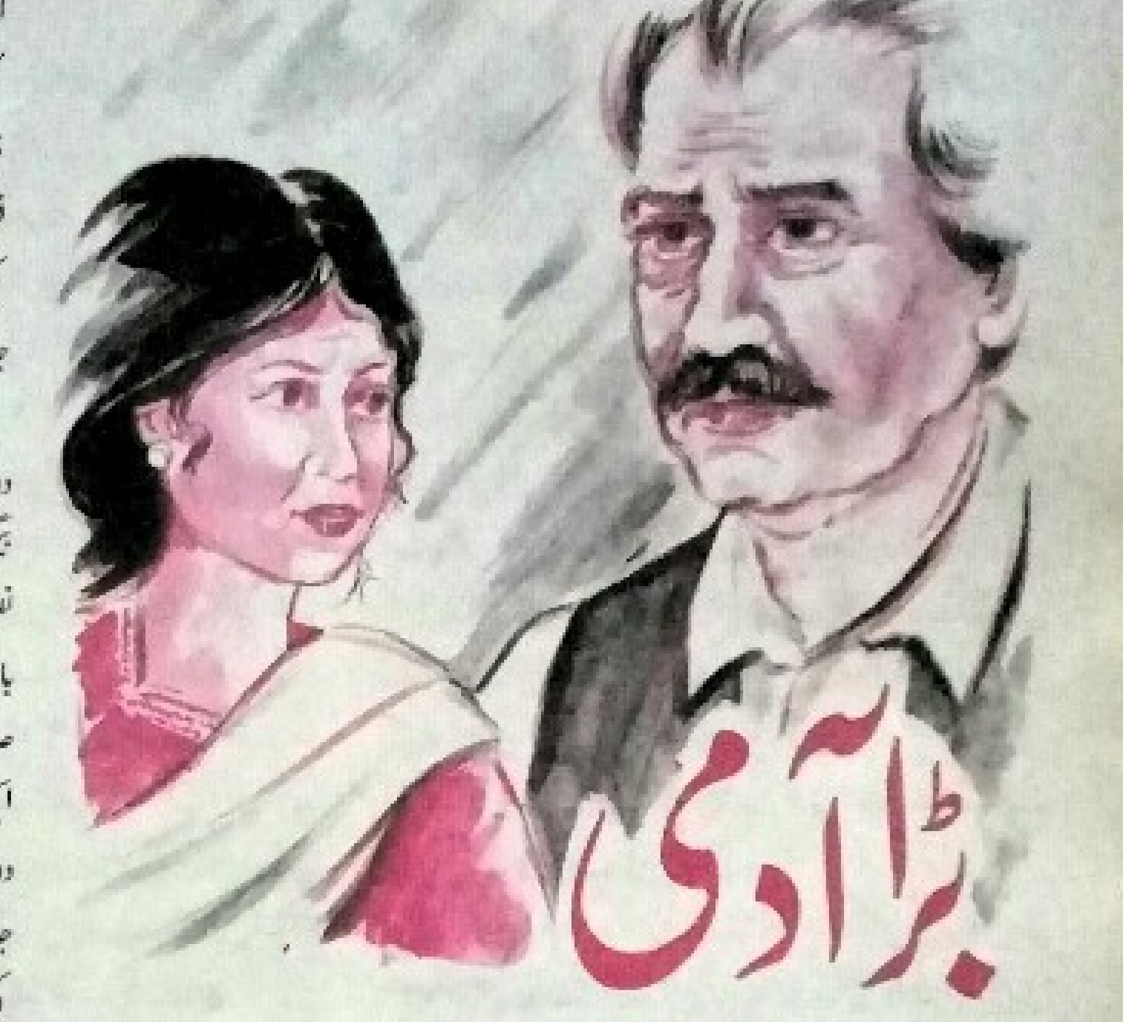

بڑا آدمی

فروا کے والد نصیب خاں کی اپنی زمینوں کے ساتھ بہت بڑی کوٹھی تھی۔ فروا ابھی تین سال کی تھی کہ اس کی والدہ فوت ہو گئیں۔ اب فروا اور اس کے والد تین ملازموں جن میں ایک مالی' ایک خان ساماں اور ایک ڈرائیور تھا' کے ساتھ رہتے تھے۔

فروا لاڈ پیار میں پلی تھی۔ فروا کا والد چاہتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی امیر گھرانے کے لڑکے سے کرے۔ مگر رشتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے فروا اب تیس برس کی ہو چکی تھی۔ اب تو وہ بہت ہی سنجیدہ رہنے لگی تھی۔ نہ ہنستی' نہ زیادہ باتیں کرتی۔

فروا کے والد اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت کڑھتے۔ اس کے رشتے کے بارے میں سوچتے۔ انہیں دو دفعہ دل کا دورہ بھی پڑ چکا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ تیسرے دورے کے بعد ہو سکتا ہے وہ زندہ نہ رہیں۔ اب ان کی سوچیں بدل گئی تھیں۔ اب وہ اس تلاش میں تھے کہ کوئی ضرورت مند لڑکا مل جائے' بے شک غریب ہی ہو' اور فروا کی شادی اس سے کر دی جائے۔ انہیں یہ بھی فکر تھی کہ اتنی بڑی کوٹھی اور زمینوں کا ان کے بعد وارث کون ہو گا کیوں کہ فروا ان کی اکلوتی بیٹی تھی اس لئے وہ چاہتے تھے کہ فروا کی جس سے شادی ہو وہ اس کوٹھی میں رہے اور یہ ساری جائیداد اس کے سپرد کر دی جائے۔

ایک دن نصیب خان کے دور کے رشتے دار امجد اور ان کی بیگم تیمار داری کے لئے آئے۔ نصیب خاں نے ان کے بچوں کے بارے میں دریافت کیا تو امجد صاحب کہنے لگے "بس کیا بتائیں ایک طرف سے سکھ ہوتا ہے تو دوسری طرف سے انسان دکھی ہو جاتا ہے۔ پچھلے برس فہیم کی شادی کی تو نصیر جو میرا بڑا بیٹا ہے' کی بیوی دو بچے چھوڑ کر اپنے رب کے پاس چلی گئی"۔

نصیب خاں نے لمحہ بھر کچھ سوچا پھر بولا "بھائی صاحب' آپ نصیر کی پھر سے شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ہماری فروا سے کوئی دو سال بڑا ہو گا"۔

امجد صاحب نے سرد آہ بھری اور بولے "ہاں بس 32'33 سال کا ہی ہو گا۔ مگر اب کون اپنی لڑکی دے گا اسے"۔

نصیب خان بولے "نصیر تو بہت نیک لڑکا تھا۔ اب پتا نہیں کیسا ہے"۔

بیگم امجد بولیں "میرا بیٹا آج بھی ویسا ہی نیک ہے"۔

اتنے میں خان ساماں چائے لے آیا۔ ساتھ ہی فروا کمرے میں داخل ہوئی۔ مہمانوں کو اس نے بڑے ادب سے سلام کیا اور اپنے ابو کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ پھر اپنے ابو کے کان میں پوچھنے لگی "ابو' میری ایک سہیلی کے بیٹے کی آج سالگرہ ہے۔ میں وہاں چلی جاؤں"۔

"ہاں بیٹا چلی جاؤ کتنی دیر میں واپس آؤ گی" نصیب خاں نے پوچھا۔

"یہی کوئی دو گھنٹے میں" فروا نے کہا اور خدا حافظ کہ کر چلی گئی۔

فروا کے والد' امجد صاحب اور بیگم امجد کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فروا کے والد نے کہا "امجد صاحب' میں تو اب چند دن کا مہمان ہوں۔ پتا نہیں کب بلاوا آ جائے۔ مجھے تو اب ہر وقت فروا کی فکر لگی رہتی ہے"۔

بیگم امجد بولیں "کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ کر اس کی شادی کر دو"۔

"اب میں بھابھی' اس بیماری کی حالت میں رشتہ کہاں سے ڈھونڈوں۔ نہ ہی اس کی والدہ ہے جو یہ کام سر انجام دے۔ اب تو آپ لوگ ہی کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈ دیں"۔

امجد صاحب بولے "نصیب بھائی' ہم غریب لوگ آپ کے معیار پر پورا اترنے والا رشتہ کہاں سے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ غریبوں کے غریب ہی دوست ہوتے ہیں"۔

نصیب خاں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولے "میرا تو خیال ہے کہ آپ اسے اپنی بیٹی ہی بنا لیں"۔

امجد صاحب اور بیگم امجد دونوں بیک آواز بولے "وہ کیسے نصیب صاحب"۔

فروا کے والد نے کہا "میرا خیال ہے نصیر اور فروا کی شادی کر دی جائے"۔

بیگم امجد بولیں "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" کہاں ہم غریب لوگ اور کہاں شہزادی فروا۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟"

"یہ ممکن ہے مگر اس شرط پر کہ نصیر اور اس کے بچے یہاں اس کوٹھی میں رہیں گے" امجد صاحب بولے

"بیٹا' ہمیں نصیر کے یہاں رہنے میں کوئی اعتراض نہیں" امجد صاحب نے کہا

پھر ہفتہ دس دن بعد نصیر اور فروا کی شادی ہو گئی۔ نصیر کی چھوٹی بیٹی حمیرا تو والد کے ساتھ آنے کو رضامند ہو گئی لیکن بڑا بیٹا الیاس کسی صورت بھی باپ کے ساتھ رہنے کے لئے رضامند نہ ہوا۔ اس نے ضد کی کہ میں دادا جان اور دادی جان کے ساتھ گاؤں میں ہی رہوں گا۔

اب الیاس ایک غریب گھر میں پل بڑھ رہا تھا۔ اور گاؤں کے پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جب کہ حمیرا نصیب خاں کی کوٹھی میں بڑے ناز و نعم کی زندگی گزار رہی تھی۔ الیاس اب پانچویں جماعت میں ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ پڑھنا چھوڑ دے گا۔ اور قریب کے شہر میں کوئی چھوٹا موٹا کام کر لے گا۔ جب اس نے یہ بات اپنی جماعت کے استاد سے کہی تو انہیں اس کا بہت دکھ ہوا۔ وہ کہنے لگے "بیٹا' میں نے جب پانچویں جماعت پاس کی تو میرے گھر والوں کی ایسی حالت نہ تھی کہ وہ شہر میں میرے تعلیمی اخراجات برداشت کرتے لہٰذا میں نے اپنی مدد آپ کے تحت شہر میں جا کر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں صبح کو اسکول کھلنے سے پہلے اخبار بیچتا تھا اس طرح اپنے تعلیمی اخراجات برداشت کرتا تھا۔ بیٹا' بڑا آدمی بننے کے لئے محنت مزدوری کرنا کوئی عیب نہیں"۔

الیاس کو اپنے استاد کی یہ بات بہت اچھی لگی۔ اس نے بھی شہر میں جا کر تعلیم حاصل کرنے اور ساتھ محنت مزدوری کر کے اپنے اخراجات برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شہر میں اخبار والے کی دکان پر گیا اور اپنی ساری بات سنائی تو اس نے الیاس کو دو تین گاؤں دے دیے جو اس کے اسکول کے راستے میں ہی تھے اور ایک کوٹھی جو شہر سے باہر تھی۔ اس نے اس علاقے کے گھروں میں ہر صبح اخبار پھینکنا ہوتا تھا۔ الیاس کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس کے پاس ایک بائی سائیکل تھی۔ وہ سائیکل پر گھر گھر جا کر اخبار دے آتا اور کوٹھی میں بھی باقاعدگی سے اخبار پہنچاتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کوٹھی میری سوتیلی والدہ کی ہے۔ لیکن جب وہ اخبار پھینکنے جاتا تو اس وقت کوٹھی کے تمام افراد آرام کر رہے ہوتے تھے۔ وہ باہر سے ہی اخبار پھینک کر واپس آ جاتا۔ ایک دن حمیرا کو محلے کی کسی عورت نے بتا دیا کہ جو لڑکا اخبار بیچتا ہے وہ آپ کا بھائی ہے۔ اب وہ اپنے سوتیلے بھائی' فائز کو اٹھا کر صبح سویرے گیٹ کے پاس آ جاتی جب کہ باقی گھر کے تمام افراد سو رہے ہوتے تھے۔ حمیرا کو اپنے بھائی الیاس سے مل کر بڑی خوشی

ہوئی- اب وہ دونوں بہن بھائی روزانہ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر لیتے-

الیاس کو کیا معلوم کہ حمیرا کو مجھ سے ملنے کی وجہ سے ڈانٹ بھی پڑ سکتی ہے- ایک دن حمیرا اس کا چھوٹا بھائی اور بڑا بھائی الیاس جو اخبار والے کے نام سے جانا جاتا تھا' باتیں کر رہے تھے کہ حمیرا کی والدہ نے دیکھ لیا- اس نے حمیرا کو بہت مارا پیٹا اور کہا کہ آپ کو جرات کیسے ہوئی کہ ایک اخبار بیچنے والے سے بات کر سکو- اتنی تربیت کے باوجود آپ کی اوقات تو وہی رہی- تم شروع سے ہی جب بھی کھیلتی ہو تو مالی کی لڑکی سے- مجھے تمہاری یہ نیچ لوگوں کو منہ لگانے والی حرکت اچھی نہیں لگتی- اب تم نصیر کے علاوہ میری بیٹی بھی کہلاتی ہو- اور میری بیٹی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی غریب اور نیچ سے بات چیت کرے-

حمیرا نے بہت کہا کہ امی جان آپ میری بات تو سن لیں لیکن فروا نے غصے میں اس کی ایک نہ سنی اور خفا ہوتی بولتی اپنے کمرے میں چلی گئی- یہ سب کچھ الیاس باہر کھڑا سنتا رہا- اب وہ چپکے سے اخبار پھینکتا اور واپس چلا جاتا- اسے اس دن کا ہی بہت دکھ تھا جب اس کی وجہ سے اس کی بہن کو اتنی مار پڑی- اس نے حمیرا کے لئے چوڑیاں اور بالوں کو لگانے والی پنیں خریدی ہوئی تھیں- لیکن وہ روزانہ جیب میں ڈال کر لے جاتا اور ویسے ہی واپس لے آتا- کیوں کہ اب حمیرا صبح گیٹ پر نہیں آتی تھی-

وقت اسی طرح گزرتا رہا- اب الیاس کافی بڑا ہو گیا تھا- اب وہ سارے شہر میں اخبار بھی بیچ لیتا تھا اور اپنی جماعت میں اول بھی آتا تھا- ایک دن وہ شہر میں اخبار بیچ رہا تھا کہ ایک گاڑی اس کے پاس کھڑی ہوئی- ڈرائیور نے اس سے اخبار مانگا- جونہی الیاس اخبار دینے کے لئے آگے بڑھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پچھلی سیٹ پر اس کے ابو بیٹھے ہوئے ہیں- ڈرائیور نے اس سے اخبار لیا اور کار جلدی سے آگے بڑھا دی- الیاس کچھ دیر خیالوں میں کھویا وہیں کھڑا رہا- پھر اس نے چوڑیاں اور پنوں کو دیکھا جو اس نے اپنی محنت کی کمائی سے خرید کر اپنی بہن کے لئے رکھی تھیں- آج تک تو وہ اپنی سوتیلی امی سے ڈرتا رہا تھا مگر اب اس نے سوچا کہ وہ آج ضرور یہ چیزیں اپنی بہن کو دے کے آئے گا-

اگلے دن جب وہ اخبار دینے گیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حمیرا بھی آج گیٹ میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے- "حمیرا بہن" اس نے کہا

قریب حمیرا کی امی کھڑی تھیں- انہوں نے الیاس کی آواز سن لی اور انتہائی غصے میں کہا "تم کون ہو حمیرا کو بہن کہنے والے' اس سے مت کلام کیا کرو اور آئندہ گیٹ کے آگے کھڑے ہونے کی جرات نہ کرنا"-

الیاس کا رنگ غصے سے سرخ ہو رہا تھا- لیکن آگے جو عورت اسے برا بھلا کہہ رہی تھی وہ اس کی والدہ تھی- اس لیے اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا "امی جان' یہ میری بہن ہے- اور نصیر صاحب میرے والد ہیں- میرا نام الیاس ہے"-

کچھ دیر تو وہ اسے حیرت سے کھڑی دیکھتی رہیں پھر بولیں "آپ نے بڑا آدمی بننا ہوتا تو اس دن ہی ہمارے ساتھ آ جاتے- اب ہمارا آپ سے کوئی رشتہ نہیں اور آئندہ سے یہاں اخبار دینے بھی نہ آنا- کیوں کہ لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ تم حمیرا کے بھائی ہو- تو پھر ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے"-

الیاس نے کہا "ٹھیک ہے امی جان' میں آئندہ یہاں نہیں

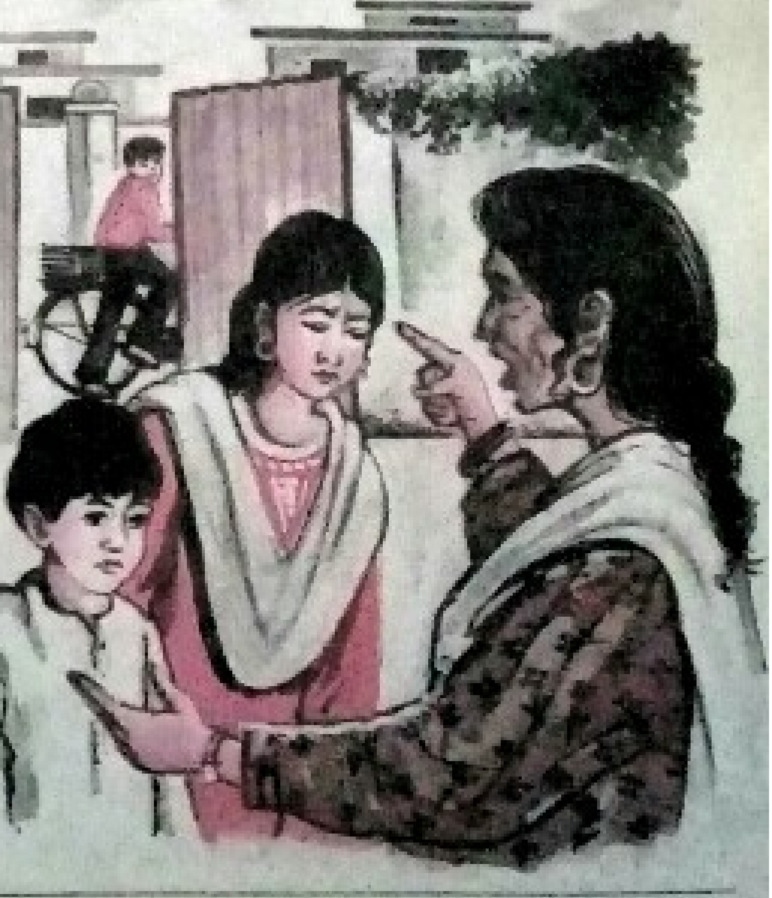

"تو ان کا مگر آپ یہ چوڑیاں اور پیسے میری بہن کو دے دیں"۔

پھر اس نے جلدی سے ہاتھ آگے بڑھا کر پیسے اور چوڑیاں۔ اپنی والدہ کے ہاتھ پہ رکھ دیں۔ وہ بہت خفا ہوئیں اور بولیں "دفع ہو جاؤ یہاں سے' لے جاؤ اپنی چوڑیاں۔ ایسی چوڑیاں تو ہمارے نوکروں کے بچے بھی نہیں پہنتے۔ اتنا شوق تھا بہن بھائیوں کا تو ہمارے ساتھ ہی آجاتے اور پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنتے۔ اب اس غربت میں اخبار نہیں بیچو گے تو اور کیا کرو گے"۔

الیاس سائیکل پر بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سنسان راستے میں پسینے میں شرابور جسم پر ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے نے اس کے غصے کو کچھ ٹھنڈا کر دیا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی آوازوں نے اس کے موڈ کو خوش گوار [illegible] بھی اس کی سوچ اپنی ماں کے ان [illegible] پر رکی [illegible] بڑے آدمی بن جاتے۔ اب [illegible] غربت میں اخبار نہیں بیچو گے تو اور کیا کرو گے۔ آئندہ یہاں مت [illegible] پڑھے لکھے گا اور بڑا آدمی ضرور بنے گا۔

وہ محنت مزدوری کرتا رہا اور خوب [illegible] لگا کر پڑھتا بھی رہا۔ آخر کار وہ پڑھ لکھ کر وکیل بن گیا [illegible] بہت اچھا وکیل جانا جاتا تھا۔ کافی [illegible] نے گاڑی بھی لے لی تھی۔ آج [illegible] سے پہلے [illegible] عورت اس کے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کافی بوڑھی [illegible] مند۔ پھٹے پرانے کپڑے لیکن اس کے بیٹھنے کا انداز اور بڑی سی چادر سے پتا چل رہا تھا کہ یہ کسی اچھے گھرانے کی مصیبت ماری بڑھیا ہے۔ اس نے بیٹھتے ہی پوچھا "جی کیا بات ہے"۔

بڑھیا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بولی "میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ جس کا بچپن میں ہی برے لڑکوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ ان لڑکوں کے ساتھ مل کر وہ چھوٹی بڑی وارداتیں کرنے لگا۔ جس سے اسے بار بار جیل کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اسے بار بار جیلوں سے رہا کروانے میں میری ساری جائیداد بک گئی۔ دن رات کی ان پریشانیوں سے میری آنکھوں کی بینائی بھی بہت کم ہو گئی اور آج اس کی ان باتوں کی وجہ سے مجھے اپنی کوٹھی بھی فروخت کرنا پڑی۔ وہ آج کل پھر جیل میں ہے اور اس پر قتل کا جھوٹا مقدمہ ہے۔ جن لڑکوں کے ساتھ یہ اٹھتا بیٹھتا تھا شیر دہار کو انہوں نے ہی قتل کیا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جس وقت وہ قتل ہوا تھا' میرا بیٹا اس وقت گھر میں سویا ہوا تھا۔ وکیل صاحب' آپ یہ سارے پیسے لے لیں۔ اور خدا کے لئے میرے بے گناہ بیٹے کو چھڑوا دیں۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر بہت بڑا آدمی بنے گا لیکن وہ ایک اچھا انسان نہ بن سکا۔ بے تحاشا دولت نے اسے فضول خرچ اور کاہل بنا دیا۔ اب تو اس کے والد بھی دنیا میں نہیں رہے۔ میرے اور نصیبوں جلی حمیرا کے علاوہ....."

وہ حمیرا کا نام سن کر چونکا پھر اس نے نظریں اوپر اٹھا کر اس [illegible] غور سے دیکھا۔ وہ اب تک نظریں نیچی کے [illegible] کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے اس بڑھیا کو کہاں دیکھا ہے [illegible] یاد آگیا اور اس نے جلدی [illegible] سوال کیا۔ "کیا آپ کا نام [illegible] ہے؟"

"ہاں' فرواں" [illegible] ہی وہ ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اور باپ کی وفات' ماں کی [illegible] حمیرا کے نصیب اور اپنے چھوٹے بھائی سے [illegible] پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ [illegible] کافی دیر [illegible] کھڑی رہیں۔ پھر بولیں "وکیل صاحب' آپ [illegible] رہے ہیں۔ یہ لو پیسے اور اگر ہو سکے تو [illegible] میرے بیٹے کو رہا کروا دو"۔

اس نے بہت ہی احترام سے کہا "امی جان' بیٹھ جایئے۔ میں آپ کا اپنا بیٹا الیاس ہوں۔ میں بغیر رقم کے ہی اپنے بھائی کو بھی رہا کراؤں گا اور حمیرا بہن کی شادی بھی کروں گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو مجھ تک پہنچا دیا۔ اب آپ رہتی کہاں ہیں"۔

"اپنے ایک خان ساماں کے گھر میں" فرواں نے کہا۔

الیاس اپنی امی اور حمیرا کو گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ پھر چند ہی دنوں میں اپنے بھائی کو بھی قتل کے جھوٹے مقدمے سے بری کروا لیا۔ فرواں نے اپنے فرماں بردار بیٹے کا ماتھا چومتے ہوئے کہا "بیٹا الیاس' واقعی وہی شخص بڑا آدمی بنتا ہے جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنی تعلیم کو جاری رکھتا ہے"۔

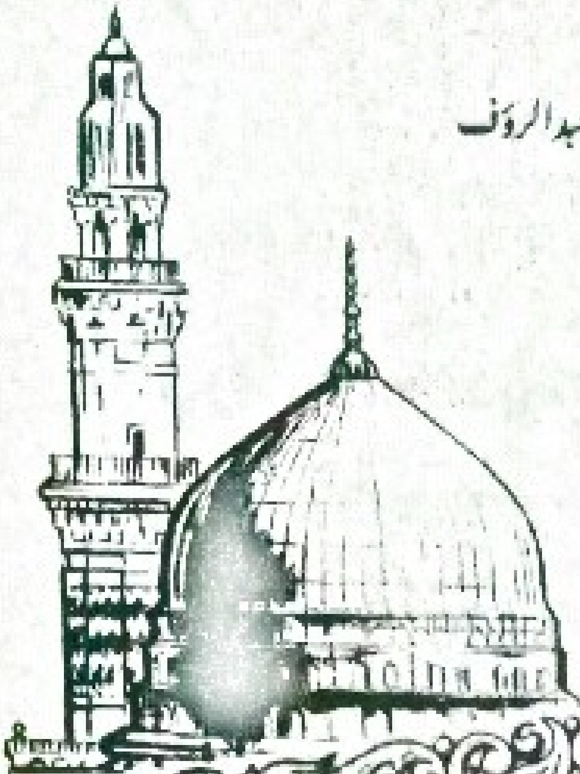

ڈاکٹر عبدالرؤف

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں

ایک دوسرے پر رحم کرنا

پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں کی اس مختصر مجلس میں ہمارا آج کا موضوع ہے: "ایک دوسرے پر رحم کرنا"۔ ہمارے پیارے نبیؐ کی ایک پیاری حدیث ہے کہ

"جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ بھی رحم نہیں کرتا"۔

ایک دوسرے پر رحم کرنا انسانیت کا بہترین ثبوت ہے۔ موجودہ مسلمانوں کی ایک خاص تعداد ایک دوسرے سے کافی محبت و شفقت اور رحم و کرم کرتی نظر آتی ہے۔ یہ بات ان کے کردار اور اخلاق کی بلندی کا اہم ثبوت ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی افسوس ناک ہے کہ پاکستان میں بچوں کی کئی اقسام ایسی ہیں جو پیار اور رحم سے یکسر محروم ہیں۔ مثلاً "یتیم بچے' مزدور بچے' بیمار بچے' وغیرہ۔

پاکستان میں متعدد بچے ابتدائی عمر ہی میں یتیم ہو جاتے ہیں۔ ان کی ایک خاصی تعداد یتیم خانوں میں داخل کروا دی جاتی ہے۔ مگر اکثر یتیم خانوں کی حالت بہت خراب ہے۔ تعلیم و تربیت' خوراک' رہائش اور تفریحات وغیرہ کی سہولتیں انتہائی ناقص ہیں۔ وہ یتیم بچے جو یتیم خانوں میں داخل نہیں ہوتے ان سے بھی ان کے رشتہ دار اچھا سلوک نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یتیم بچے رحم اور شفقت کو ترستے رہتے ہیں۔

مزدور بچے بھی ایسی ہی محروم دنیا میں بستے ہیں۔ کارخانوں' دفتروں' ہوٹلوں اور گھروں میں اجرت پر کام کرنے والے بچوں سے بھی ہم غیر مناسب سلوک روا رکھتے ہیں۔ جو بچے اغوا ہو کر بیگار کیمپوں میں قید ہو جاتے ہیں ان کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔

اکثر بیمار بچے بھی رحم و کرم کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ غریب بیمار بچوں کے نادار والدین مہنگی دوائیوں اور معقول خوراک کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتے۔ سنگ دل ڈاکٹروں کی عدم توجہی جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔ ان کی جذباتی محرومی کئی دفعہ سنگین صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ہمارے گھروں' مسجدوں اور مدرسوں میں جو نظام تعلیم و تربیت رائج ہے اس میں رحم و کرم کے جذبوں کو فروغ دینے کا کوئی سائنسی اہتمام موجود نہیں۔ رحم و کرم عام کرنے کے لئے ایک بہت بڑے جہاد کی ضرورت ہے جو ان تمام باتوں کا عملی پرچار کرے جو ہمارے پیارے نبیؐ نے اس سلسلہ میں فرمائی ہیں۔

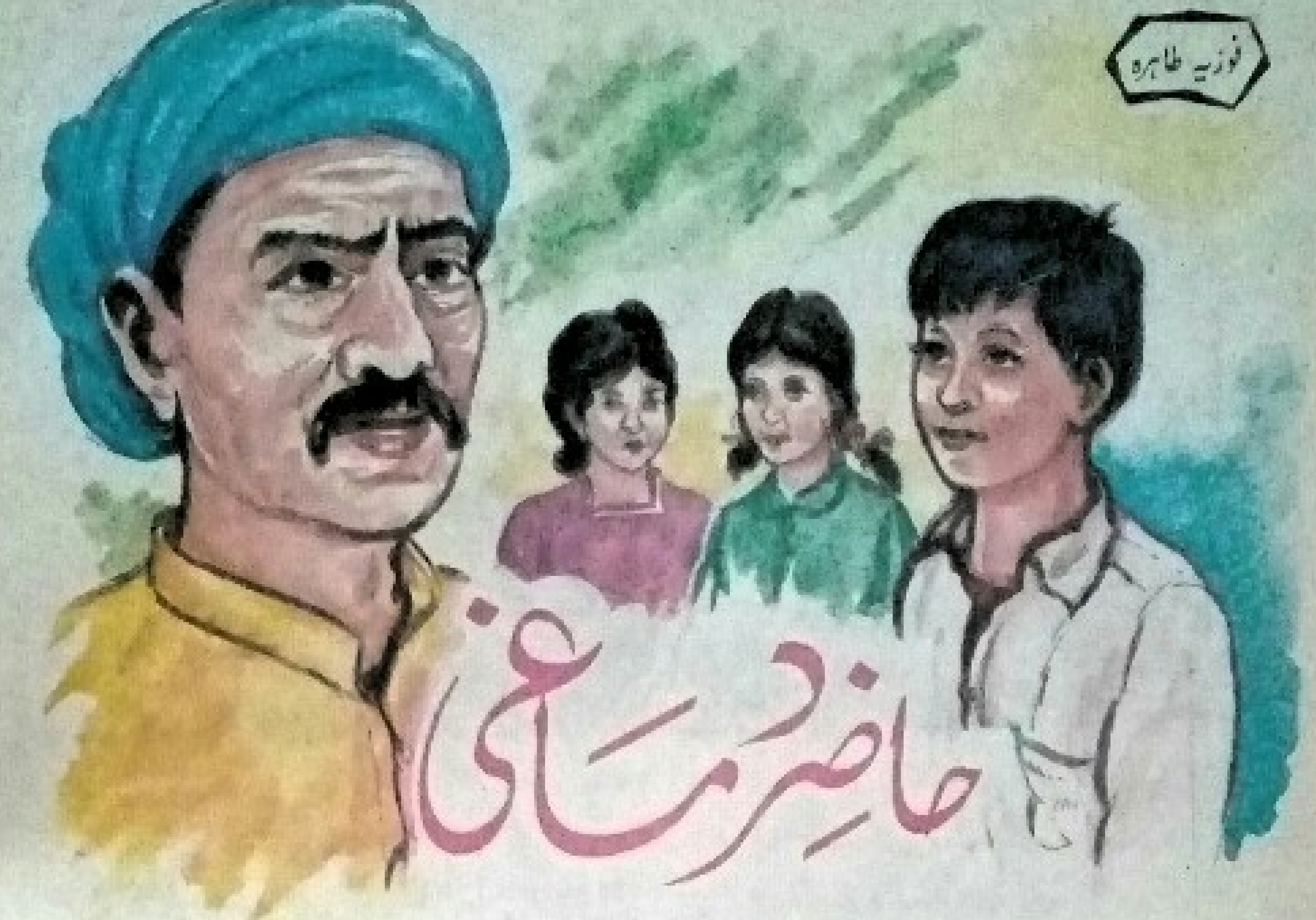

حاضر دماغی

فوزیہ طاہرہ

رمضان علی بڑا محنتی معمار تھا۔ اس کی 3 بیٹیاں اور دو بیٹے تھے، سب سے بڑا بیٹا شوکت نویں جماعت میں تھا جب کہ اس سے چھوٹی دو بیٹیاں ساتویں اور چھٹی میں تھیں۔ اس نے تنگ دستی کے باعث دونوں چھوٹے بچے اسکول میں داخل نہیں کروائے تھے۔ اسے اپنے بڑے بیٹے شوکت سے بڑی امید تھی کہ وہ پڑھ لکھ جائے گا۔ اچھی نوکری مل جائے گی۔ گھر کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔

یہ پہلا اتفاق تھا کہ اسے ایک سرکاری عمارت کی تعمیر کا کام مل گیا تھا اور تقریباً" ایک سال سے متواتر دہاڑیاں لگ رہی تھیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اب وہ فکر مند بھی رہنے لگا تھا کیوں کہ تعمیر کا کام صرف 15، 20 دن کا رہ گیا تھا...... ایک بات اس کے لیے خوش گوار بھی تھی، جب سے اسے ٹھیکے دار نے یہ بتایا تھا کہ اس عمارت کے افتتاح کے موقع پر ملک کے عظیم راہ نما بھی آئیں گے اور سب مزدوروں سے ملاقات کریں گے۔ وہ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا تھا۔

"ابا، مجھے بھی ساتھ لے جا" شوکت نے خاموشی سے قریب بیٹھتے ہوئے رمضان علی سے کہا۔

"وہاں بڑی سختی ہے۔ ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ رمضان علی نے جواب دیا"۔

شوکت چاہتا تھا کہ وہ بھی ملکی راہ نماؤں کو قریب سے دیکھے اور اسکول جا کر دوستوں پر اپنا رعب جما سکے۔ شوکت کی ماں نے بھی بیٹے کی حمایت کی۔ آخر کار رمضان علی نے اسے ساتھ لے جانے کا وعدہ کر لیا۔

شوکت کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، رمضان علی کو بھی کئی دن سے اسی خوشی میں نیند نہیں آ رہی تھی، رات گہری ہو رہی تھی، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ "الٰہی خیر ہو..... اس وقت کون آسکتا ہے؟" رمضان علی یہ کہ کر اٹھا۔ دروازہ کھولا تو ایک خوش لباس اجنبی کو اپنے سامنے پایا، باوجود کوشش کے بھی وہ اسے پہچان نہ پایا، اجنبی اس کی حیرت کی وجہ جان چکا تھا۔ اس لیے مسکرا دیا اور اشارے سے باہر آنے کے لیے کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنا محسن ہی سمجھو" اجنبی نے رمضان کو بڑی اپنائیت سے کہا۔

"لیکن.... آپ اتنی رات کو.... میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھا....؟" رمضان علی نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اجنبی ایک خوب صورت سفید گاڑی میں جا بیٹھا اور رمضان علی کو بھی ساتھ کی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آج کل میں بھی ایک پلازہ تعمیر کروا رہا ہوں سنا ہے کہ تم بڑے منجھے ہوئے معمار ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ جب تم اپنے پہلے کام سے فارغ ہو جاؤ تو میرے ہاں آکر کام کرو"۔

رمضان علی تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس بات کے لیے وہ کئی دن سے پریشان تھا' وہ پریشانی اتنی آسانی سے حل ہو جائے گی۔

"جی ضرور.... صاحب جی.... میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا" رمضان علی نے اجنبی کے ہاتھ سے اُس کا وِزٹنگ کارڈ پکڑتے ہوئے کہا۔

"چند روز بعد میں پھر آؤں گا" یہ کہ کر اجنبی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔ رمضان علی دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کرنے لگا۔ گھر آکر اُس نے اپنی بیوی کو بھی یہ خوش خبری سنائی۔

دن پر لگا کر اُڑنے لگے۔ اجنبی جس کا نام وزٹنگ کارڈ پر راجا ریاض الدین لکھا تھا' چند دن بعد اُس نے ڈرائیور بھیج کر رمضان علی کو اپنے دفتر میں بُلوا لیا' دفتر کیا تھا اچھا خاصا محل لگتا تھا۔

"یہ لیجیے نئے گھر کی چابی" راجا ریاض الدین نے چابی رمضان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نیا گھر.... کس کا.... میں.... میں.... سمجھا نہیں جی...."۔

رمضان علی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ راجا ریاض اُس پر اس قدر مہربان کیوں ہے؟

"تمھارا بوسیدہ سا گھر تمھارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ آج ہی نئے گھر میں منتقل ہو جاؤ.... تم بھی ہمارے جیسے انسان ہو' تمھارے بچّے بھی سائشیں چاہتے ہیں.... اس لیے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرو...." راجا ریاض الدین نے اس کے ہاتھ میں چابی تھماتے ہوئے کہا۔

رمضان علی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو' ساری عمر بھی کماتا رہتا تو اپنا جھونپڑا بھی نہ بنا پاتا۔

"اور ہاں.... جس دن افتتاحی تقریب ہوگی میں تمہیں خود لینے کے لیے آؤں گا"۔ راجا ریاض الدین تو رمضان کے لیے فرشتہ ثابت ہوا تھا' رمضان ایک دو دن کے اندر نئے گھر میں منتقل ہو گیا' فرنیچر سے بھرا ہوا گھر جس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔

"میں راجا انکل سے کہوں گی ہمیں ایک گاڑی بھی لے دیں.... لمبی سی" ننھی نے لمبی پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بس بس' زیادہ لالچ اچھا نہیں ہوتا' انہوں نے جو کچھ دے دیا یہی بہت ہے" رمضان علی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ابا! اب ہمیں اسکول میں بھی داخل کروا دے نا" ننھی اور ٹونی نے جھٹ سے اگلی فرمائش جڑ دی۔

رمضان علی نے بھی سوچ رکھا تھا کہ اب وہ اپنے دونوں بچوں کو کسی بڑے اسکول میں داخل کرائے گا تاکہ خوب پڑھ لکھ سکیں۔ راجا ریاض الدین نے اُسے کچھ پیشگی رقم بھی دے دی تھی تاکہ نئے کپڑے سلوا سکے' رمضان اور شوکت نے نئے کپڑے اور نئے جوتے خرید لیے تھے۔ زندگی میں انہیں یہ پہلا موقع ملا تھا کہ وہ مُلک کے بڑے بڑے لیڈروں کے ساتھ ہاتھ ملا سکیں گے۔

"اللہ تعالیٰ نے ایک ساتھ کتنی خوشیاں دے ڈالی تھیں۔ خاندان والے بھی اُن کی اس کایا کلپ پر حیران تھے' رمضان علی کے ذہن میں بارہا یہ خیال آیا کہ وہ راجا ریاض الدین سے ان سب مہربانیوں کی وجہ پوچھے مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہتا کہ نیک لوگ بے غرض ہوتے ہیں' اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اس کی مخلوق کی بہتری پر خرچ کرتے ہیں۔

اس نے ذہن کو جھٹک دیا' اگلے دن صبح دونوں باپ بیٹا افتتاحی تقریب میں جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے' حمیرا' سمیرا' ننھی اور ٹونی کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی ساتھ جائیں لیکن سیکورٹی کے پیش نظر ہر کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی' شوکت کے لیے بھی خصوصی اجازت نامہ حاصل کیا گیا تھا۔

آج تو جیسے عید ہو۔ راجا ریاض الدین کا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ گاڑی کا ہارن سنتے ہی سب بچے گیٹ کی طرف دوڑے لیکن اسی دوران میں راجا ریاض الدین گیٹ کے اندر داخل ہو چکا تھا' اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط خوش نما چمڑے کا تھیلا تھا' وہ رمضان علی سے ہاتھ ملا کر اسے الگ کمرے میں لے گیا۔

"مجھے تم سے آج بہت ضروری کام ہے' کرو گے نا؟" راجا ریاض الدین نے کہا۔

"آپ تو میرے محسن ہیں' میں بھلا آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں" رمضان علی نے جواب دیا۔

"تو پھر سنو' پوری توجہ کے ساتھ۔ اس تھیلے کے اندر ایک ڈبّہ ہے جو میں نے پیک کر رکھا ہے۔ بس اسے اپنے ساتھ اندر لے جانا اور احتیاط سے کسی ایسی جگہ رکھ دینا جہاں بڑے بڑے راہ نما بیٹھے ہوں"۔

"لیکن کیوں؟ آخر اس میں ہے کیا؟" رمضان نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

تم میرے بھروسے کے آدمی ہو۔ اس لیے یہ بات صرف اپنے تک رکھنا۔ اس میں ایک ٹائم بم ہے۔ کچھ مُلک دُشمن وہاں آئے ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان دشمنوں کو اڑا دیا جائے"۔ راجا ریاض الدین نے اپنے اصل مقصد کو چھپاتے ہوئے بات بنا ڈالی تاکہ رمضان مطمئن ہو کر اس کا کہا مان جائے۔

"ٹائم بم.....!" لیکن یہ سب راہ نما تو ہمارے محسن ہیں' ہم سب ان سے محبّت کرتے ہیں۔ یہ مُلک دُشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟" رمضان علی نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"زیادہ بحث مت کرو۔ یہ میرا حکم ہے۔ مجھے انکار سننے کی عادت نہیں' سمجھے۔ جیسا کہا ہے ویسے ہی کرو!" راجا ریاض الدین نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

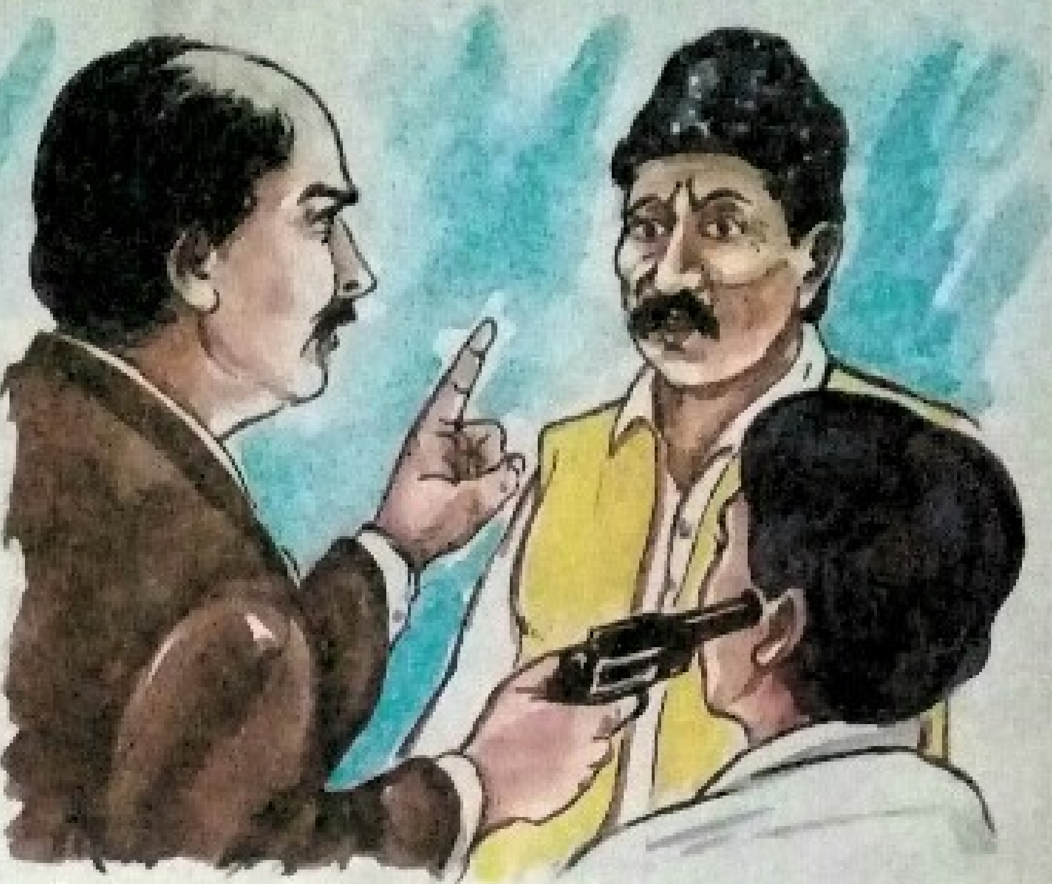

"لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا' چاہے آپ میری جان ہی کیوں نہ لے لیں۔ میں شور مچا دوں گا.... میں.... میں.... ابھی پولیس کو اطلاع کرتا ہوں" رمضان علی ہر خطرے سے بے پروا ہو کر بولے جا رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آچکا تھا کہ اس اجنبی شخص نے اس قدر مہربانیاں اس پر کیوں کر رکھی تھیں۔ گھر' پیسا' ملازمت' آسائشیں..... لیکن کئی جانوں کے عوض.... اف خدایا.... وہ یہ سوچ کر ہی کانپ گیا۔

راجا ریاض الدین کو اندازہ ہو چلا تھا کہ رمضان آسانی سے ماننے کا نہیں۔ اس نے بہانے سے شوکت کو کمرے میں بلایا اور اس کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھ دی۔

"اگر تم یہ ٹائم بم میرے کہنے کے مطابق ساتھ لے کر نہ گئے تو میں تمھارے بیٹے پر گولی چلا دوں گا..... صرف آدھا گھنٹا باقی رہ گیا ہے' پورے بارہ بجے یہ بم اپنے آپ پھٹ جائے گا' اس لیے ضد مت کرو۔"

رمضان علی اپنی ضد پر قائم تھا' شوکت اب اصل معاملہ بھانپ چکا تھا۔ "انکل' میں بھی ابا کے ساتھ جا رہا ہوں..... یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کیا کرنا ہے؟"

شوکت کی بات سُن کر راجا ریاض الدین کی تو باچھیں کھل گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے پا جائے گا۔

"شاباش تو ہمارے کام کا ہے۔ جیسا میں تجھے سمجھاؤں گا بالکل ویسا ہی کرنا۔ غداری کی سزا گولی ہے" ریاض الدین نے کہا۔

"شوکی بیٹا! تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ یہ شخص ملک دشمن ہے۔ اس کی باتوں میں مت آ۔"

"ابا' تو احسان فراموش ہے۔ راجا انکل کے ہم پر بہت سے احسانات ہیں۔ یہ گھر' پیسا سب انھی کی بدولت ہے۔ آج میں تیرا کہا ہرگز نہیں مانوں گا" شوکت نے اپنے باپ کو کھری کھری سنا ڈالیں۔

رمضان ہکا بکا رہ گیا' وہ سوچ رہا تھا کہ اُس نے ہمیشہ اپنی اولاد کو رزقِ حلال کھلایا ہے۔ پھر بھلا اس کے بچوں کی تربیت غلط کیسے ہو سکتی ہے۔ دُکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"چلیے انکل' ورنہ دیر ہو جائے گی" یہ کہہ کر شوکی راجا ریاض الدین کے ساتھ' تھیلا اُٹھائے گھر سے باہر آگیا اور دونوں گاڑی میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف چل دیے' رمضان اور اُس کی بیوی گم صم سر تھامے بیٹھے تھے' پھر اُسے خیال آیا' کیوں نہ پولیس کو فون کر دیا جائے تاکہ پولیس بروقت پہنچ کر حالات پر قابو پا سکے۔ وہ بجلی کی تیزی سے اُٹھا اور تھانے کا نمبر ملانے لگا مگر وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

ادھر ڈرائیور کو بار بار ہدایت دی جا رہی تھی کہ گاڑی تیز چلائے۔ ریاض اور شوکی دونوں پچھلی نشست پر بڑی حفاظت سے تھیلا رکھے بیٹھے تھے۔

"ڈرائیور، گاڑی روک لو" شوکی نے درشت انداز میں ڈرائیور سے کہا۔

"لیکن کیوں؟ وقت کم ہے۔ ہمیں جلد از جلد پہنچنا ہے" ریاض نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ڈرائیور تمہیں پتا ہے ہمارے اس بیگ میں کیا ہے؟"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا" راجا ریاض الدین نے شوکی کی بات سُن کر اُسے ڈانٹا۔

"جی نہیں۔ مجھے کیا خبر، میں تو جی نوکر ہوں راجا صاحب کا" ڈرائیور نے نہایت مسکینی سے کہا۔

"میں چپ نہیں رہوں گا، راجا۔ اس میں ٹائم بم ہے میں چیخ چیخ کر سب کو بتاؤں گا"۔

"کیا ٹائم بم؟" ڈرائیور یہ سنتے ہی تھر تھر کانپنے لگا۔

"بکواس بند کر بدذات، کمینے۔ میں تجھے گولی سے اڑا دوں گا"۔ ریاض الدین کے منہ سے غصّے سے جھاگ نکلنے لگا۔ بدحواسی میں ڈرائیور نے گاڑی ایک درخت سے جا ماری اور موقع غنیمت جانتے ہوئے وہاں سے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ لیکن راجا اور شوکی ایک دوسرے کے دست و گریباں ہو چکے تھے، شوکی پستول چھیننا چاہتا تھا تاکہ راجا اس پر گولی نہ چلا دے۔ وہ راجا کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا تاکہ ایسے ملک دشمنوں کو دنیا کے سامنے بے نقاب کیا جا سکے۔

ریاض شوکی کی چالاکی کو سمجھ نہیں پایا تھا اور خوش تھا کہ رمضان تو جھانسے میں نہیں آیا لیکن اُس کا بیٹا اس کے قابو میں با آسانی آگیا ہے۔ حال آں کہ شوکی نے وقتی طور پر ڈرامہ کر کے راجا ریاض الدین پر اپنا اعتبار جما لیا اور انتہائی سمجھ داری کے ساتھ اُسے چکما دینے میں کام یاب رہا۔ راجا ریاض الدین جلد از جلد اس جگہ سے دور بھاگنا چاہتا تھا کیوں کہ 12 بجنے میں چند ہی گھڑیاں رہ گئی تھیں۔ لیکن قدرت نے اسے بھاگنے کا موقع ہی نہ دیا اور ایک زبردست دھماکے نے آس پاس کی آبادی کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ دھواں اور گرد کے بادل تھے۔ آن کی آن میں قریب کی بستی کے لوگ جائے حادثہ پر جمع ہو چکے تھے۔

اگلی صبح اخباری نمایندے رمضان علی کے گھر پہنچ چکے تھے، آج ملک کے بڑے بڑے راہ نما رمضان علی کے پہلو بہ پہلو بیٹھے شوکت کی شہادت پر اُسے دلاسہ دے رہے تھے۔ اس کے بیٹے نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک کی کتنی اہم شخصیتوں اور کتنی ماؤں کے بیٹوں کو ہلاکت سے بچا لیا تھا اور خود شہادت کا رتبہ پا لیا تھا۔

آیئے دوست بنائیں

میاں محمد زاہد نواز 13 سال
کرکٹ
ہاؤسنگ کالونی نزد میاں نواز
کریانہ اسٹور ننکانہ صاحب

شاہد رشید شہزاد 17 سال
قلمی دوستی
رشید اینڈ سنز حسین کالونی
چشتیاں

ارشد جاوید 15 سال
ٹکٹ جمع کرنا
عمر کالونی پی اے ایف روڈ
سرگودھا

محمد اویس الرحمان 13 سال
کرکٹ
قادریہ دواخانہ ملتان روڈ
عبدالحکیم

محمد حسین بھٹی 16 سال
کرکٹ
محمد بخش بھٹی کلاتھ مرچنٹ مین
بازار قائم پور

حبیب اللہ بھٹی 18 سال
سیر کرنا
نزد گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول
کروڑ لعل عیسن

ہاشم خان 12 سال
کرکٹ
عید گاہ روڈ ضلع ہنگو کوہاٹ

فواد حسین چشتی 14 سال
کرکٹ
سون کلینک' حسین آباد- احمد
پور شرقیہ

مختار احمد مدنی 15 سال
تعلیم حاصل کرنا
مختار احمد مدنی بستی رحیم گل
تحصیل میلسی ضلع وہاڑی

محمد سرفراز اسلم 16 سال
نعتیں پڑھنا
مکان نمبر B-3/977 روڈ
کالا نوالی گجرات

اصغر علی خان 17 سال
کرکٹ
گوبند گڑھ گلی نمبر 12 برانچ نمبر
6 جناح روڈ گوجرانوالہ

محمد عاصم عتہ 14 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
حکیم عبداللطیف عتہ تھانہ روڈ
منڈی بہاؤالدین

حسن فرخ 14 سال
کرکٹ کھیلنا
مکان نمبر 352 شمس آباد کالونی
ملتان

عبدالمنان انصاری 16 سال
کرکٹ' قلمی دوستی
اریگیشن آفیسر واٹر ڈویژن
نواب شاہ

عبدالمتین یوسف 17 سال
سکے جمع کرنا
مکان 12 سٹریٹ 171 مدینہ
کالونی باغبانپورہ لاہور

عامر شہزاد ونو 16 سال
پینٹنگ
4/C پی ایم کالونی داؤد آباد
بورے والہ

شاہ زیب احمد شاہ 14 سال
سائنسی معلومات جمع کرنا
عوامی کلاتھ ڈپو ریلوے روڈ
ہنگو

نوید احمد گل 17 سال
کہانی نویسی
چوہدری مبارک علی گل
ایڈووکیٹ' کچہری روڈ چنیوٹ

عرفان اللہ شائق 16 سال
کراٹے' قلمی دوستی
سوکڑی کریم خان بنوں

تنزیل الرحمان علوی 16 سال
علوی ہیلتھ محمد حسین کالونی
راجن پور

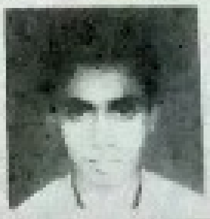

محمد سعید سرور 16 سال
قلمی دوستی
جالندھر ہاؤس محلہ عید گاہ-
وارڈ نمبر 15-پتوکی

مدثر خلیل 17 سال
الیکٹرانکس
G-43 آفیسرز کالونی فرید ٹاؤن
ساہیوال

آیئے دوست بنائیں

کے لیے یہ کوپن پر کر کے اور پاسپورٹ سائز بلیک اینڈ وائٹ تصویر بھیجنا ضروری ہے
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام.................. عمر..................
مشاغل..................................
پتہ....................................

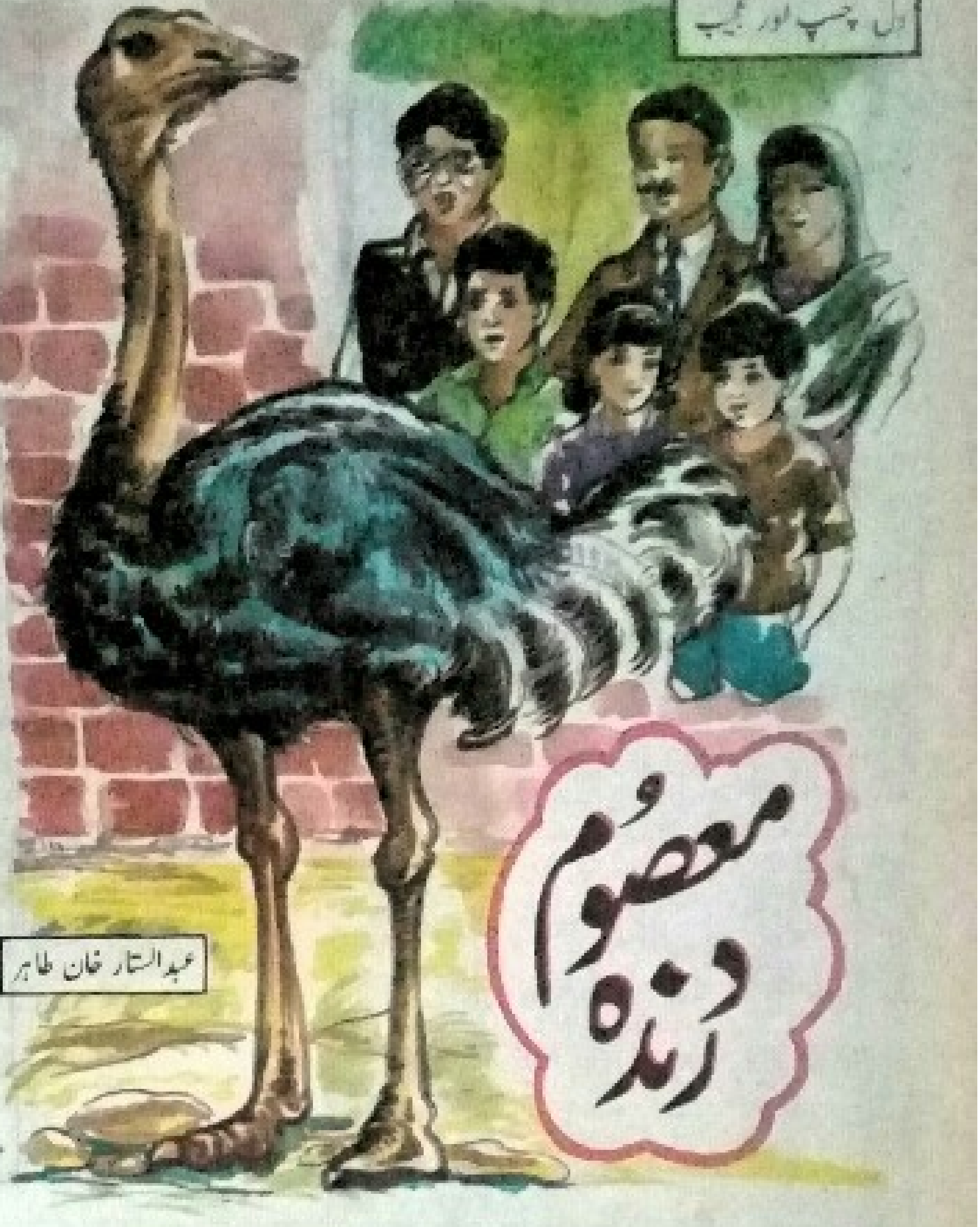

معصوم درندہ

عبدالستار خان طاہر

اِس دفعہ ہم عید سے اگلے دن لاہور کے چڑیا گھر گئے۔ ہماری پک نک پارٹی کل چھ افراد پر مشتمل تھی۔ جن میں امی ابو، ہمارے ماموں آفتاب احمد جو لاہور کے ایک کالج میں زوآلوجی (Zoology) کے پروفیسر ہیں۔ (زوآلوجی علم حیاتیات کی ایک شاخ ہے جس میں جانوروں کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں) اس کے علاوہ آٹھ سالہ ننھا عرفان، دس سالہ نوشین اور میں خود یعنی ارسلان، تمام افراد نے چڑیا گھر کی خوب سیر کی اور لطف اندوز ہوئے لیکن جب ہم چڑیا گھر کے اُس حصے میں گئے جہاں ایک جنگلا نما پنجرے میں شتر مرغ بند تھا تو عرفان اُسے دیکھتے ہی چلّا اُٹھا "دیکھو ماموں جان یہ کتنا بڑا مرغ ہے"۔

عرفان کی یہ بات سن کر ہم سب ہنس پڑے۔ ماموں جان بولے "بیٹا عرفان، یہ مرغ نہیں ہے۔ اس کو شتر مرغ کہتے ہیں۔ شتر عربی میں اونٹ کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مرغ اونٹ کی طرح کا ہے۔ مثلاً اس کی بڑی بڑی ٹانگیں، اور لمبی گردن اونٹ سے ملتی جلتی ہیں۔ اِس کے علاوہ یہ صحرائی جانور ہے اور اونٹ بھی صحرائی جانور ہے"۔

"ماموں جان، اِس کا چہرہ کتنا معصوم اور بھولا لگتا ہے۔ اپنی چال ڈھال سے تو یہ بالکل بے ضرر سا پرندہ معلوم ہوتا ہے" نوشین نے کہا جو کافی دیر سے اس عجیب و غریب پرندے کو بڑی حیران کن نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن بیٹا اس کا بھولپن اور معصومیت چڑیا گھر تک ہی محدود ہے۔ جنگلوں اور صحراؤں میں اس کے دوڑنے کی رفتار 40 میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔ یہ کسی انسان یا جانور پر حملہ کر دے تو یہی دونوں پاؤں جو ابھی تمہیں بے ضرر محسوس ہو رہے ہیں، اپنے دشمن کے پیٹ میں اس قدر زور سے مارتا ہے کہ پیٹ پھٹ جاتا ہے اور انتڑیاں باہر نکل آتی ہیں۔ گھوڑے کی دولتی سے تو انسان صرف زخمی ہوتا ہے لیکن شتر مرغ کی دولتی جان سے مار ڈالتی ہے۔ شتر مرغ اگر گروہ کی صورت میں ہوں تو یہ شیر کو بھی بھگا دیتے ہیں"۔

"واہ ماموں جان، آپ تو اس عجیب و غریب پرندے کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں" میں نے کہا۔ پھر ہم سب بچے ماموں

جان کے پیچھے پڑ گئے کہ آپ ہمیں شترمرغ کے متعلق مزید بتائیں۔

"بچو! شترمرغ کے متعلق اب مزید باتیں گھر جا کر اپنے ماموں سے سن لینا۔ اب آؤ کھانا کھا لیں" ابو جان، جو کہ اتنی دیر سے خاموش کھڑے ہماری باتیں سن رہے تھے، نے کہا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے باقی ماندہ چڑیا گھر کی سیر کی اور پھر گھر آ کر ہم نے دوبارہ ماموں جان کو گھیر لیا کہ وہ ہمیں شترمرغ کے متعلق مزید بتائیں۔

"بچو! یہ پرندہ افریقہ کے جنگلوں اور صحراؤں میں پایا جاتا ہے" ماموں جان نے بات آگے بڑھائی۔ "شترمرغ اڑ نہیں سکتا۔ یہ دوڑتا ہے اور دوڑتے وقت دونوں پروں کو پھیلاتا ہے جس سے اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ صحرائی شترمرغ ہرن سے بھی زیادہ تیز بھاگتے ہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ اونچائی آٹھ فٹ اور وزن ساڑھے تین من سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسے دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے پرانا پرندہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کی نظر اور سننے کی حس اس قدر تیز ہے کہ ڈیڑھ میل دور سے خطرے کو دیکھ بھی لیتا ہے اور آہٹ بھی پا لیتا ہے۔ اگر بھاگنا چاہے تو بھاگ جاتا ہے یا وہیں بیٹھ جاتا ہے اور گردن کو پروں تلے چھپا کر پروں کو اس طرح کھڑا کر لیتا ہے کہ دیکھنے والے اسے صحرائی جھاڑی سمجھ کر قریب سے گزر جاتے ہیں۔ اگر خطرہ سر پر آن پہنچے تو شترمرغ بھاگنے کی بجائے مقابلہ کرتا ہے۔"

"ماموں! شترمرغ انڈے دیتا ہے یا بچے؟" تو شین نے پوچھا تو ماموں جان نے بتایا کہ شترمرغ ایک گڑھا کھود لیتے ہیں اور مادہ شترمرغ اس گڑھے میں انڈے دیتی ہے۔ صحرا میں تو ہر وقت دھوپ رہتی ہے۔ شترمرغ ایسی جگہ گڑھا کھودتے ہیں جہاں کسی درخت کا سایہ نہ پڑے تاکہ انڈے کو سورج کی حرارت مسلسل ملتی رہے۔ اس کا ایک انڈہ مرغی کے انڈے سے بارہ گنا بڑا ہوتا ہے۔ اور اس کا وزن ڈیڑھ سیر کے قریب ہوتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا خلیہ (Cell) اسی شترمرغ کے انڈے کو مانا گیا ہے۔ مادہ انڈے دے کر فارغ ہو جاتی ہے۔ انڈوں کی حفاظت نر کا کام ہوتا ہے۔ نر انڈوں پر بیٹھتا نہیں بلکہ بچے نکالنے کے لیے دھوپ کی تپش کافی ہوتی ہے۔ صحرا کی دھوپ آگ کی طرح جھلسا دینے والی ہوتی ہے۔ شترمرغ کو خدا نے اتنی سوجھ بوجھ دی ہے کہ وہ محسوس کر لیتا ہے کہ انڈوں کو ضرورت سے زیادہ گرمی پہنچ رہی ہے۔ وہ انڈوں پر اپنے پروں کا سایہ کر دیتا ہے۔ نر پورے 40 روز تک انڈوں کے قریب گھوم پھر کر پہرہ دیتا اور انڈوں کو اوپر تلے کرتا رہتا ہے۔ مادہ اسے وہیں کھانا دانہ پہنچاتی رہتی ہے۔ 40 دنوں کے بعد انڈوں میں بچے تڑپنے لگتے ہیں تو نر انڈوں کو توڑ کر بچے باہر نکال لیتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے انڈوں سے اس قدر بدبو اٹھتی ہے کہ فوراً ہی سینکڑوں مکھیاں ان پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ یہی مکھیاں ان بچوں کی پہلی خوراک بنتی ہیں۔

رابرٹ سرکلے نے نیروبی کے پارک میں جہاں تمام

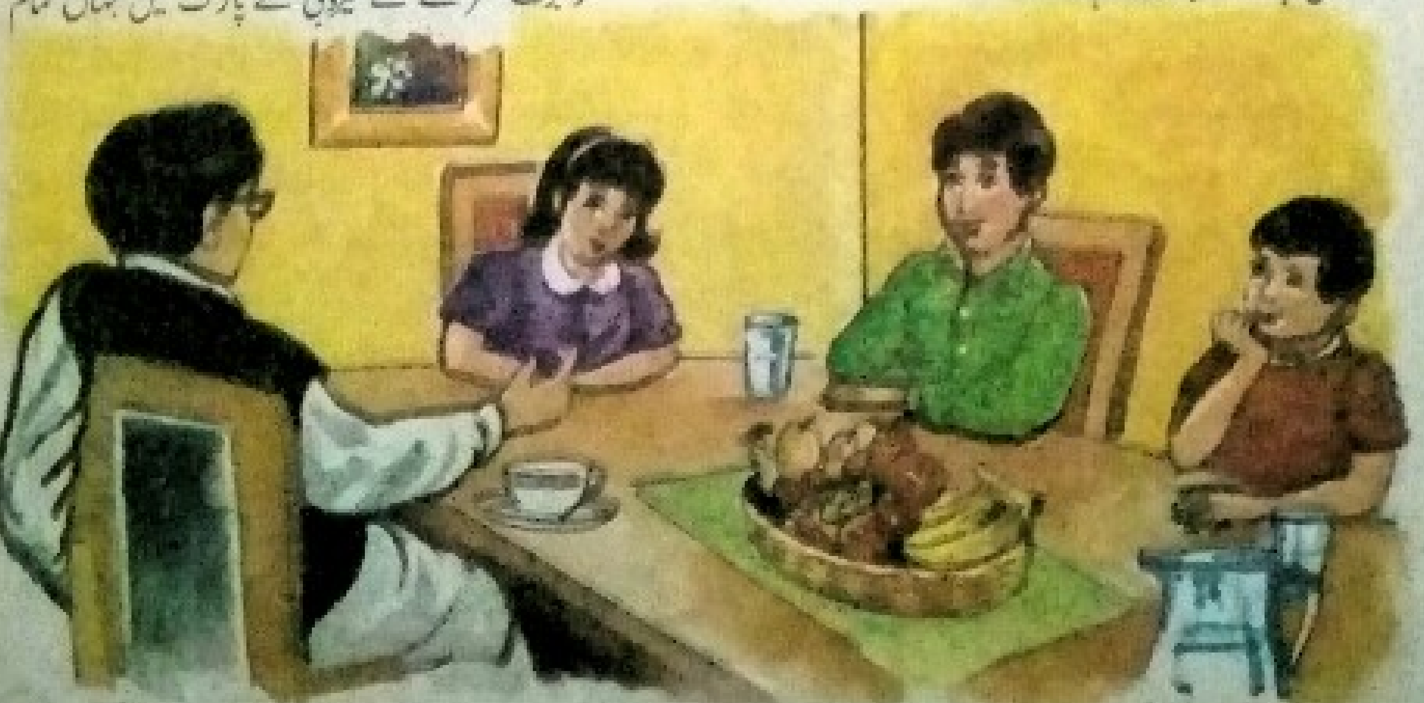

درندے اور دیگر جانور کھلے پھرتے ہیں' شتر مرغ کے انڈے دینے سے لے کر بچے نکلنے تک کا مشاہدہ گڑھے سے دور بیٹھ کر دوربین سے کیا- ایک روز ایک نر شتر مرغ اور چار مادہ شتر مرغ گڑھے کے قریب کھڑے تھے کہ ایک چیتا ٹانگوں کو دُہرا کیے گھاس میں چھپتا ہوا' دبے پاؤں اُن کی طرف بڑھ رہا تھا- یہ چیتے کی مخصوص چال ہوتی ہے- وہ اسی پوزیشن میں شکار کے قریب پہنچ جاتا ہے اور شکار کو اُس وقت معلوم ہوتا ہے جب چیتا اُسے اپنے بے رحم پنجوں اور دانتوں میں جکڑ چکا ہوتا ہے-

رابرٹ لکھتے ہیں کہ اس پارک میں کسی درندے پر گولی چلانے کی اجازت نہیں ورنہ میں اس چیتے کو گولی مار دیتا- توقع یہی تھی کہ چیتا کسی ایک شتر مرغ کو دبوچ کر اٹھالے جائے گا اور باقی بھاگ جائیں گے- لیکن میں نے ایک حیران کن منظر دیکھا- شتر مرغ کے حساس کانوں نے محسوس کر لیا کہ کسی طرف سے کوئی خطرہ سرکتا چلا آرہا ہے- پانچوں شتر مرغ ایک دائرے میں اس طرح کھڑے ہو گئے کہ ان کی دُمیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں اور منہ باہر کی جانب تھے- وہ چوکنے ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے- ایک نے تیز آواز نکالی- اس نے چیتے کو گھاس میں رینگ کر آگے آتے دیکھ لیا تھا- پانچوں شتر مرغ دوڑ پڑے اور چیتے کے اردگرد دُور دُور کھڑے ہو کر اس کا گھیراؤ کر لیا- چیتے کی ساری پھرتی بے کار گئی تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور غرا کر ایک شتر مرغ کی طرف دوڑا- ایک دوسرے شتر مرغ نے بڑی تیزی سے دوڑ کر چیتے کے ایک پہلو میں دولتی ماری- دولتی اتنی شدت سے لگی کہ چیتا دوسرے پہلو کے بل گرا اور اٹھا ہی تھا کہ دوسری طرف سے دوسرے شتر مرغ نے ایسی ہی دولتی ماری- میں نے دیکھا کہ چیتے کی انتڑیاں اور پیٹ کے باقی حصے باہر نکلنے لگے اور وہ گر کر تڑپنے لگا-

شتر مرغ اُسے دیکھتے رہے- جب وہ بے حس ہو گیا تو وہ انڈوں کے گڑھے کے قریب جا کھڑے ہوئے- مجھے پارک کے ملازموں نے بتایا کہ یہ کوئی بدقسمت چیتا تھا جو شتر مرغوں سے پنجہ آزمائی کرنے چلا آیا تھا- ورنہ انڈوں کے موسم میں ببر شیر بھی ان کے قریب سے نہیں گزرتا-

"ماموں جان' اگر اچانک شتر مرغ سامنے آجائے تو اس کے حملے سے کیسے بچا جا سکتا ہے" ننھے عرفان نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا-

"پہلی بات تو یہ ہے کہ شتر مرغ خاص علاقوں میں ہوتے ہیں- ہمارے علاقے میں صرف چڑیا گھر کے پنجروں میں دیکھے جا سکتے ہیں- اس لئے یہاں اچانک کسی طرف سے شتر مرغ کے نکل آنے کا خطرہ نہیں- پھر بھی آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ شتر مرغ کے حملے سے بچنے کے لئے ایک کانٹوں والی جھاڑی ہاتھ میں رکھی جاتی ہے- جب شتر مرغ حملہ کرے تو جھاڑی آگے کر دی جاتی ہے- شتر مرغ رک کر جھاڑی کو دیکھتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے- اس کے حملے سے بچنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ شتر مرغ حملہ کرے تو بیٹھ جائیے یا پیٹ کے بل لیٹ جائیے- وہ آپ کو چھوڑ کر چلا جائے گا- یا آپ کے نہایت آہستہ آہستہ دو چار چونچیں مارے گا اور چلا جائے گا- اس کی چونچ بے ضرر ہوتی ہے- اب میں تمہیں شتر مرغوں کے متعلق مزید بتاتا ہوں" ماموں جان نے ہماری دل چسپی کو بھانپتے ہوئے کہا-

"قد اور طاقت کے لحاظ سے ارجن ٹائن کے شتر مرغ زیادہ مشہور ہیں- ایک سیاح ولرڈ پرائس نے ان کے متعلق نہایت دل چسپ مشاہدے کیے ہیں- وہاں کے لوگ اس کے پروں کی ٹوکریاں اور ٹوپیاں بنا کر بازار میں بیچتے ہیں- شتر مرغ کو پکڑنا ان کے لئے بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے- وہ اتنے امیر نہیں کہ بندوق خرید سکیں- وہ شتر مرغ کے انڈوں کا گڑھا ڈھونڈ لیتے ہیں اور اسے چوری چھپے دیکھتے رہتے ہیں- جب بچے نکلتے ہیں اور شتر مرغ ان کے لئے دانہ دنکا لینے چلے جاتے ہیں تو یہ لوگ بچوں کو اٹھا لاتے ہیں- انہیں گھروں میں پالتے اور بڑا کر کے کھا جاتے ہیں- کئی بار شتر مرغ بچوں کی بُو پا کر اس سمت دوڑ پڑتا ہے اور انسان کو تھوڑی ہی دور جا لیتا ہے- پھر نہ صرف اپنے بچوں کو چھڑا لیتا ہے بلکہ اپنے بچوں کے چور کا پیٹ بھی پھاڑ دیتا ہے-

ان لوگوں نے شتر مرغوں کو پکڑنے کا ایک اور طریقہ بھی اختیار کر رکھا ہے- ولرڈ پرائس لکھتا ہے کہ اس کا گائیڈ جس کا نام پیڈرو تھا' اُسے ریگستان میں لے گیا- ہم گھوڑوں پر سوار تھے-

پیڈرو کے پاس تین چار گز لمبی رسّی تھی۔ جس کے دونوں سروں کے ساتھ لوہے کے گولے بندھے ہوئے تھے۔ ہمیں شتر مرغوں کا ایک غول نظر آیا۔ پیڈرو نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی تو شتر مرغ اکٹھے دوڑنے لگے۔ پیڈرو نے گھوڑے کو ایک طرف کر لیا تو شتر مرغوں کا غول گھوم گیا۔ اس طرح پیڈرو اُنہیں ایک چکر میں بھگاتا رہا اور گھوڑے کو ان کے قریب لاتا رہا۔ موزوں فاصلے پر پہنچ کر اس نے رسّی کو درمیان سے پکڑ کر سر کے اُوپر لے جا کر گھمایا اور شتر مرغوں کی طرف پھینکی۔ دونوں سروں سے بندھے ہوئے گولوں کے وزن سے رسّی تن گئی اور گولے گھومنے لگے۔ پھر رسی ایک شتر مرغ کو جا لگی اور گولوں نے گھوم کر رسی کو اس کی ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر اُسے جکڑ لیا۔ شتر مرغ گر پڑا۔ پیڈرو نے جا کر اس کی ٹانگیں باندھیں اور ہم اسے گھر لے آئے۔

شتر مرغ کی ٹانگیں جکڑی جائیں تو وہ چونچ سے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

بچو' ایک روز ولرڈ پرائس پیڈرو کی لوہے کے گولوں والی رسّی جسے وہ اپنی زبان میں بولاس کہتے ہیں' لے کر پیدل ہی ریگستان میں چلا گیا۔ اس نے ایک جگہ 65 شتر مرغ دیکھے۔ وہ بڑے آرام سے کھڑے تھے۔ وہ ان کے اتنا قریب چلا گیا کہ اب وہ ان پر رسی پھینک سکتا تھا۔ اُسے دیکھ کر شتر مرغوں میں ہل چل پیدا ہوئی۔ اور وہ اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ اس نے گھما کر رسی پھینکی جو ان سے بہت دور جا گری۔ شتر مرغوں نے دیکھا کہ وہ ان کے کسی ساتھی کو پکڑنے آیا ہے تو وہ سارے اس کی طرف دوڑے۔ وہ گھبرا گیا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ مگر چند قدم پر شتر مرغوں نے اسے آلیا۔ وہ اور تیز دوڑا تو منہ کے بل گر گیا۔ سارے شتر مرغ اُسے گھیرے میں لے کر چونچیں مارنے لگے۔ اُسے اب اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ لیکن اسی اثنا میں اُسے دو دھماکے سنائی دیئے اور شتر مرغ بدک کر بھاگ اُٹھے۔ اس نے دیکھا کہ پیڈرو سرپٹ گھوڑا دوڑاتا آ رہا تھا اور ریوالور سے فائر کر رہا تھا۔ پیڈرو نے اُسے بتایا کہ اس کے آنے کے فوراً بعد وہ گھر آیا تو دیکھا کہ وہ اُس کی بولاس سمیت غائب ہے تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی تلاش میں بھاگ اٹھا۔ اس نے ولرڈ پرائس کو بتایا کہ وہ خوش قسمت ہے کہ گر پڑا۔ اگر کھڑا ہوتا تو شتر مرغ اس کے جسم کے کئی حصے کر چکے ہوتے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ بولاس پھینکنا اتنا آسان نہیں۔ اس کے لئے کئی مہینے مشق کرنا پڑتی ہے۔

"کیوں بچو' اب تو تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ شتر مرغ اتنا معصوم اور بھولا پرندہ نہیں جتنا تم اسے سمجھتے تھے" ماموں جان نے اپنی گفت گو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں ماموں جان' یہ تو واقعی بڑا خطرناک پرندہ ہے۔ اب تو میں بالکل اس کے قریب نہیں جاؤں گا" ننھے عرفان نے خوف سے اپنی گول گول آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا اور ماموں جان نے پیار سے اُسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ ہم سب نے شتر مرغ کے متعلق اتنی زیادہ معلومات بتانے پر ماموں جان کا شکریہ ادا کیا اور پھر ڈائننگ ہال میں لگے ہوئے شام کے کھانے کا رُخ کیا۔

کھیلوں کی دنیا

اسکواش ریکٹ

ناقابلِ یقین ریکارڈ

سید شوکت اعجاز

28 نومبر 1981ء ______ یہ کینیڈا کا شہر ٹورنٹو ہے۔ اسکواش کورٹ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ تماشائیوں میں بہت بڑی تعداد کینیڈا میں مقیم پاکستانیوں کی ہے جو آج ناقابل شکست آسٹریلین جیف ہنٹ اور پاکستان کے نوعمر شیر دل کھلاڑی جہانگیر خان کے درمیان ورلڈ اوپن کا فائنل دیکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ کھیل سے ایک دن پہلے جہانگیر خان کندھے کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے تھے کوچ رحمت خان ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ کھیل کے آغاز میں انہوں نے منصوبے کے مطابق جیف ہنٹ کو آگے پیچھے لمبے لمبے شاٹ کھلا کر تھکانے کی کوشش کی لیکن تجربہ کار کھلاڑی جیف ہنٹ نے گیند کو دیوار پر اونچا مارنا شروع کر دیا جس کا جواب جہانگیر خان کو کندھا اٹھا کر دینا پڑتا تھا۔ کندھے کی تکلیف ناقابل برداشت تھی لیکن عزم اور جذبہ تکلیف پر حاوی تھا۔

جہانگیر نے اپنے تیز رفتار کھیل سے اپنے مدمقابل کو اس قدر تھکا دیا تھا کہ اب اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور سانس لینے کے لیے وہ بار بار کھیل روک کر ریفری سے جھنجلاہٹ میں الجھ پڑتا تھا۔ پہلی گیم جہانگیر کندھے میں شدید تکلیف کی وجہ سے ہار گیا لیکن بھرپور حوصلے اور عزم کی بدولت اگلی تینوں گیمز جیت کر ورلڈ چیمپئن کا اعزاز حاصل کر لیا۔ اور یوں اسکواش کی تاریخ کا سب سے کم عمر جگمگاتا ستارہ عالمی افق پر نمودار ہو گیا۔

پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ مختلف کھیلوں کے حوالے سے کھلاڑیوں کی بے مثال اور شان دار کارکردگی سے بھری پڑی ہے لیکن اسکواش ریکٹ میں بین الاقوامی سطح پر ہمارے جواں ہمت کھلاڑیوں کے کارنامے منفرد اور نمایاں ہیں۔ ایسی کامیابیاں دنیا کا کوئی دوسرا ملک آج تک حاصل نہیں کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکواش دنیا بھر میں پاکستان کی پہچان اور عزت کی علامت ہے۔

بلے اور گیند کے اس عالمی کھیل کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہ کھیل 32 فٹ لمبے اور 21 فٹ چوڑے مستطیل شیشے کے بند کمرے میں دو کھلاڑی کھیلتے ہیں۔ اس کھیل کے بارے میں یہ بھی روایت ہے کہ 1880ء میں لندن کے قید خانوں میں قیدی تنہائی دور کرنے کے لیے بند سیلوں کی دیواروں پر گیند مار کر اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے۔ دیواروں سے گیند کے ٹکراؤ سے جو چھناکے دار آواز پیدا ہوتی تھی اس سے اس کا نام اسکواش پڑ گیا۔

اسکواش انگلستان کے ایک کھیل ریکٹ سے ملتا جلتا ریکٹ انیسویں صدی کے آغاز میں کھیلا جاتا تھا۔ اسکواش بڑے عجیب و غریب انداز سے وجود میں آیا۔ وہ اس طرح کہ بڑی تعداد میں کھلاڑی لڑکے جو ریکٹ کھیلنے کے لیے آتے وہ اکثر ریکٹ کورٹس سے ملحق دیواروں کے ساتھ گیند کو مارتے تھے پھر یہ مشقیں ایک باقاعدہ کھیل کا رخ اختیار کر گئیں اور ریکٹ سے مختلف ہونے کی وجہ سے اسکواش ریکٹ کا کھیل وجود میں آ گیا۔

1930ء کے شروع میں یہ کھیل خاصا مقبول ہو چکا تھا۔ لندن کے اطراف میں بہت زیادہ اسکواش کلب بن چکے تھے بعد میں اس کھیل کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مشہور بحری جہازوں کو 'کین میری' 'کار تھیجنا' 'ایمپرس آف برطانیہ' 'فرانکونیا' اور 'نیو ایمسٹرڈیم' میں بھی اسکواش کورٹس بنا دیے گئے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے اسکواش ریکٹ برطانیہ کی فوج میں خاصا مقبول ہو چکا تھا۔ چوں کہ برصغیر میں

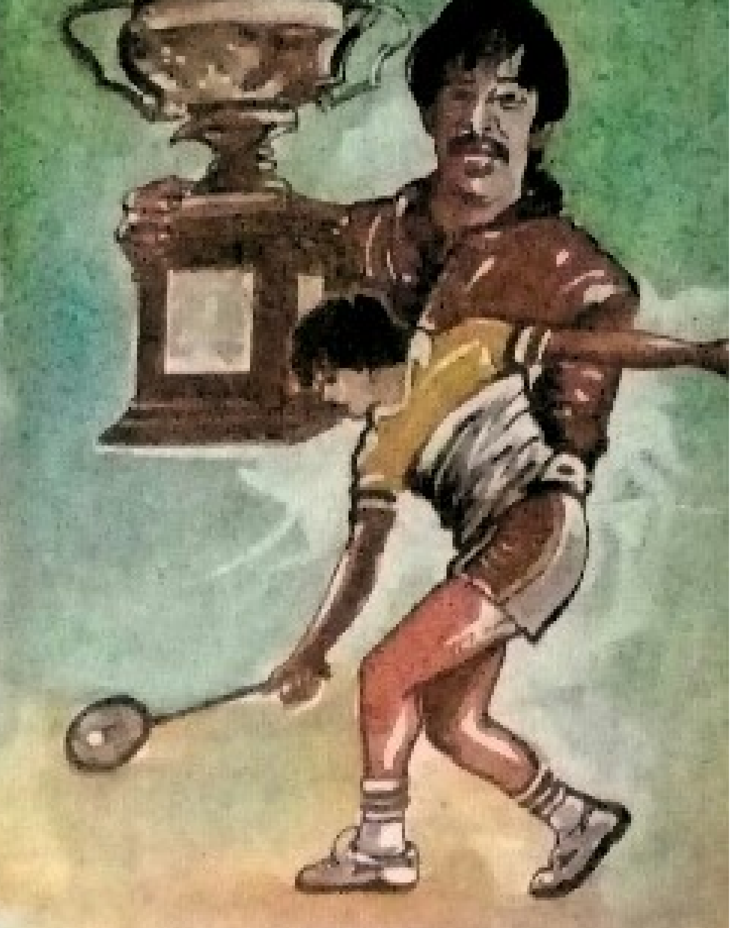

برطانوی فوج کا تسلط تھا جو زیادہ تر شمال مغربی سرحد پر موجود تھی وہاں کے موسمی حالات اس کھیل کے لیے بہت سازگار تھے۔ لہٰذا انہوں نے بڑی تعداد میں یہاں اسکواش کورٹس تعمیر کروائے۔ اس طرح پاکستان میں یہ کھیل متعارف ہوا۔

پاکستان میں اسکواش اور خان فیملی کی قدریں مشترک ہیں۔ خان فیملی کے جوان ہمت کھلاڑیوں نے برطانیہ اور امریکا میں اپنے کھیل سے دھوم مچا رکھی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد خان برادران (ہاشم خان، اعظم خان اور نذر اللہ اور روشن خان) اسکواش کے کھیل میں نمایاں ترین کھلاڑی مانے جاتے تھے۔

اسکواش کھیل کی مقبولیت دیکھتے ہوئے انٹرنیشنل اسکواش فیڈریشن کا وجود عمل میں آیا جس کا پہلا افتتاحی اجلاس جنوری 1967ء میں منعقد ہوا۔ اس وقت اس کے بانی ممبران کی تعداد صرف سات (انگلینڈ، آسٹریلیا، پاکستان، بھارت، نیوزی لینڈ، ساؤتھ افریقہ اور مصر) تھی جو اب بڑھ کر 60 سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔

انٹرنیشنل اسکواش پلیئرز ایسوسی ایشن 1973ء میں بنی۔ اس کے ذمے ورلڈ اوپن کا انعقاد، عالمی درجہ بندی اور ٹورنامنٹس کے کمپوز رینکنگ پوائنٹس تیار کرنا ہے۔ جب کہ انٹرنیشنل اسکواش فیڈریشن کے ذمے اس کھیل کے قوانین بنانا ہے۔ ورلڈ ٹیم مقابلے منعقد کروانے کی ذمہ داری بھی اسی کے ذمے ہے۔

اب اسکواش کھیل بہت پھیل چکا ہے اور دنیا کے مختلف ممالک میں کئی بین الاقوامی مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ کھلاڑی سارا سال بے حد مصروف رہتے ہیں۔ پہلے برٹش اوپن جیتنے والا عالمی چیمپین کہلاتا تھا۔ اس وقت اسکواش کے جو عالمی مقابلے ہوتے ہیں ان میں ورلڈ اوپن، برٹش اوپن، آسٹریلین اوپن، پاکستان اوپن، نیوزی لینڈ اوپن، جرمن اوپن، فرنچ اوپن، ملائشین اوپن، ورلڈ ماسٹرز، اسپا ماسٹرز، سوئس ماسٹرز بہت اہم ہیں۔ ان مقابلوں میں جیتنے والوں کو بڑی بھاری رقوم بطور انعام دی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستانی کھلاڑیوں کو بیک وقت ان تمام مقابلوں کے چیمپین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

اسکواش کی دنیا میں ہاشم خان کی آمد نے پاکستان کو متعارف کرایا اور پھر اسے ناقابل تسخیر بنا دیا۔ ہاشم خان نے سات بار برٹش اوپن جیتی۔ اس دوران میں ان کے ہم عصر بھائیوں اعظم خان اور روشن خان نے بھی برٹش اوپن جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے علاوہ محب اللہ خان سینئر نے بھی برٹش اوپن جیتی۔ لیکن درمیان میں ایک دور ایسا بھی آیا جب برطانوی کھلاڑی جونا بیرنگٹن 6 سال تک پاکستانی کھلاڑیوں اور برٹش اوپن کے درمیان حائل رہا۔ اس کے بعد آسٹریلوی کھلاڑی جیف ہنٹ نے 6 سال تک برٹش اوپن جیتا۔

1982ء میں جہانگیر خان نے برٹش اوپن جیت کر یہ اعزاز دوبارہ پاکستان کو دلوایا۔ آج کل برٹش اوپن جیتنے کا اعزاز پاکستانی کھلاڑی جان شیر خان کے پاس ہے۔ کچھ ماہ پہلے ہی انہوں نے یہ اعزاز چھٹی بار مسلسل جیتا ہے۔ یوں یہ عالمی اعزاز مسلسل 15 سال سے پاکستان کے پاس ہے۔ جان شیر خان نے 8 بار ورلڈ اوپن کا منفرد اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔ جہانگیر خان نے برٹش اوپن مسلسل 10 مرتبہ جیتی ہے۔ مجموعی طور پر پاکستان نے 29 بار برٹش اوپن جیتی ہے جو ایک ناقابل یقین عالمی ریکارڈ ہے۔

ہاشم خان سے جان شیر خان تک ایک طویل دور ہے۔ ایک ایسا دور جو اسکواش کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ آج پاکستان کا نام اس کھیل کی بدولت دنیا کے کونے کونے میں جانا جاتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور ہمارے کھلاڑیوں کی ان تھک محنت، عزم اور بلند حوصلے کا نتیجہ ہے۔

آئیے مسکرائیں

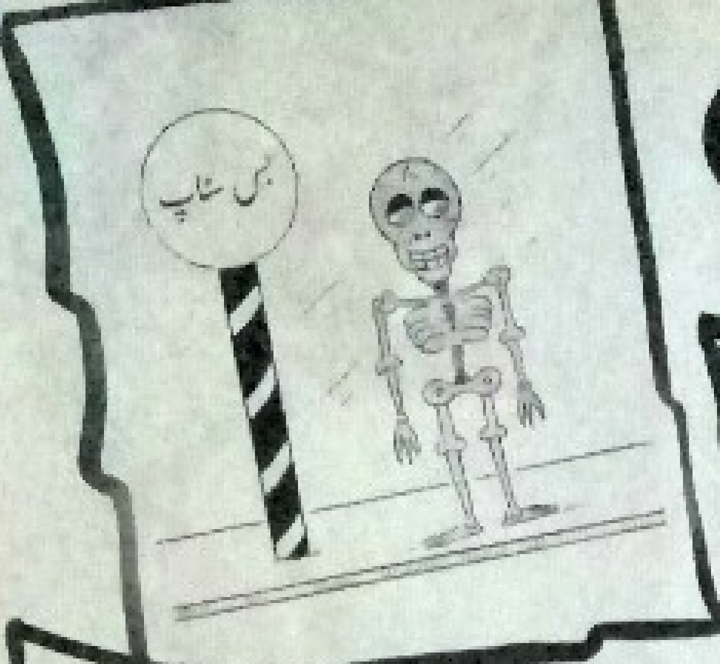

☆ ایک انسپکٹر کی بیوی نے اپنے شوہر کے بٹوے میں سے کچھ روپے نکال لیے۔ انسپکٹر کی نظر پڑ گئی۔ اس نے بیوی کی کلائی پکڑ لی اور بولا "میں تمہارا شوہر ہی نہیں بلکہ پولیس والا بھی ہوں اور تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں"۔
بیوی نے ان روپوں میں سے 10 روپے نکالے اور جلدی سے انسپکٹر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی "چلو چھوڑو بھی، بات یہیں ختم کرو" (بلال احمد شاہ لاہور)

☆ ایک صاحب دماغی امراض کے ڈاکٹر سے طرح طرح کے سوال پوچھ رہے تھے۔ ایک سوال ان صاحب نے کچھ یوں پوچھا "ڈاکٹر صاحب، یہ بتایئے کہ ایک شخص دماغ کے بغیر کتنا عرصہ زندہ رہ سکتا ہے؟"
ڈاکٹر صاحب جو انتہائی عاجز آ چکے تھے، جل کر بولے "میں زیادہ تو نہیں جانتا البتہ آپ کی عمر کیا ہے؟ (مسرور بشیر گوجرانوالہ)

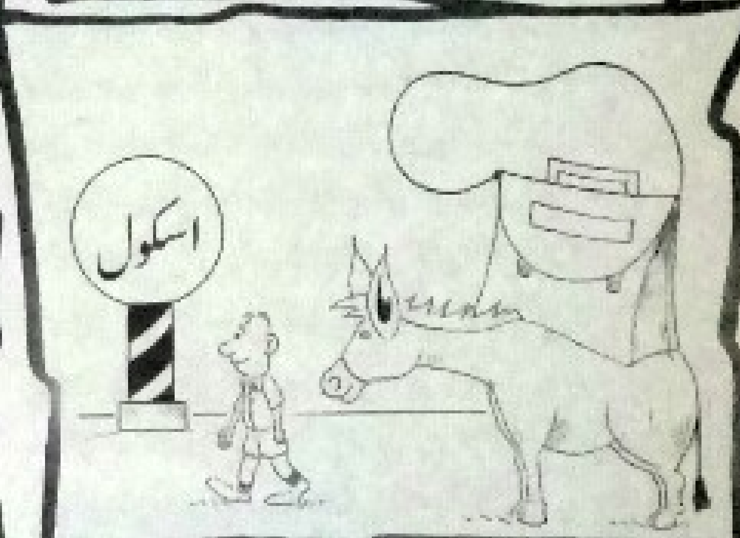

☆ اسلم: ابو کل ہم امیر ہو جائیں گے۔
باپ: بیٹا وہ کیسے؟
اسلم: ابو کل ہمارے ریاضی کے سر ہمیں پیسوں کے روپے بنانے کا طریقہ بتائیں گے (کرن اسلم بہاولپور)

☆ گاہک: میاں تم نے جو بیج دی وہ گھر جاتے ہی مر گئی۔
دکان دار (حیرت سے): اچھا! مگر اس نے ایسی حرکت میرے ہاں تو کبھی نہیں کی تھی (رابعہ آفتاب لاہور)

☆ استاد (عامر سے): یہ تم گھر کا کام کر کے لائے ہو؟ اتنی غلطیاں کرو گے تو کیسے علم حاصل کرو گے؟
عامر: سر، یہ میں نے نہیں لکھا میرے ابو نے لکھا ہے (محمد خالد رمضان، قادر پور راں)

ایک بے باک سپاہی

ڈاکٹر رضوان ثاقب

"ایک روز کا ذکر ہے کہ میں لندن کی ایک سڑک پر کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا ایک شخص تیز تیز قدم اُٹھائے چلا جا رہا ہے۔ اُس کے سر پر ترکی ٹوپی اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ انگریزوں کے دیس میں ترکی ٹوپی دیکھ کر میرا دل چاہا کہ اُس سے کچھ باتیں کروں۔ میں نے اُس کے قریب جا کر سلام کیا۔ اُس نے گھوم کر پیچھے دیکھا پھر مجھے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے بولا "تم یہاں کیسے؟"

"پہلے آپ بتائیے کہ آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی، کیا پوچھتے ہو۔ اس انگریز نے تو ہندوستان میں آفت مچا رکھی ہے۔ یہ ہماری ساری تہذیب کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ میں یہاں اس کی خبر لینے آیا ہوں۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

"حضور، یہ لندن ہے لندن۔ آپ تو اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے صلیبی جنگوں کے ہیرو سلطان صلاح الدین ایوبی آپ ہی ہیں۔ یہاں زبان پر قابو رکھیے ورنہ اُلٹا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ارے ارے تو اتنا طاقت ور ہو کر بھی ایسی بزدلی اور کم ہمتی کی باتیں کر رہا ہے۔ میں سمجھا تو ان کو میٹھی آواز میں نغمۂ توحید سنانے آیا ہے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح جان لو کہ یہ بندر تیری ڈگڈگی پر ناچنے سے رہے۔ انہیں تو میں تگنی کا ناچ نچانا چاہتا ہوں"۔

—O—

یہ ایک بے باک سپاہی کا لندن میں اپنے دوست خواجہ کمال الدین سے پہلی ملاقات کا احوال ہے جو خواجہ صاحب نے خود بیان کیا ہے۔ وہ تحریکِ آزادی کا عظیم مجاہد اور انگریزی تہذیب کے سخت خلاف تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ برطانیہ کی ایک رقص پارٹی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ناچ گانے کی محفلیں سجاتی ہوئی حیدر آباد پہنچی۔ ان محفلوں کا اہتمام انگریزوں نے سرکاری طور پر کیا تھا۔ یہ محفل بھی اُنہی کے حکم سے سجائی گئی تھی۔ پروگرام کے اختتام پر اس بے باک سپاہی سے کہا گیا کہ ان سرکاری مہمانوں کے فن کا شکریہ ادا کرے۔ مگر اسلام کے اس نڈر سپاہی نے اسٹیج پر آکر شکریہ ادا کرنے کے بجائے مغربی تہذیب کی برائیاں بیان کرنی شروع کر دیں اور اس نے مغربی تہذیب کو حیا سوز اور اخلاق سے عاری تہذیب قرار دیتے ہوئے کہا۔

"میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایسے فضول مظاہروں کا شکریہ ادا کروں"۔

اس واقعہ نے ریاست حیدر آباد کے انگریز افسروں کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ چناں چہ اس کے نتیجے میں 1909ء میں اس عظیم مجاہد کو حکومت کے خلاف سازش

کے الزام میں ریاست سے نکال دیا گیا۔ اسی پر بس نہ کی بلکہ مسلمانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور بدگمانیاں پھیلانے پر لگا دیا گیا۔ لیکن جب اس مجاہد نے عوام کے سامنے اپنا موقف بیان کیا تو دشمن کی یہ سازش بھی ناکام ہو گئی۔ اس نے کہا:

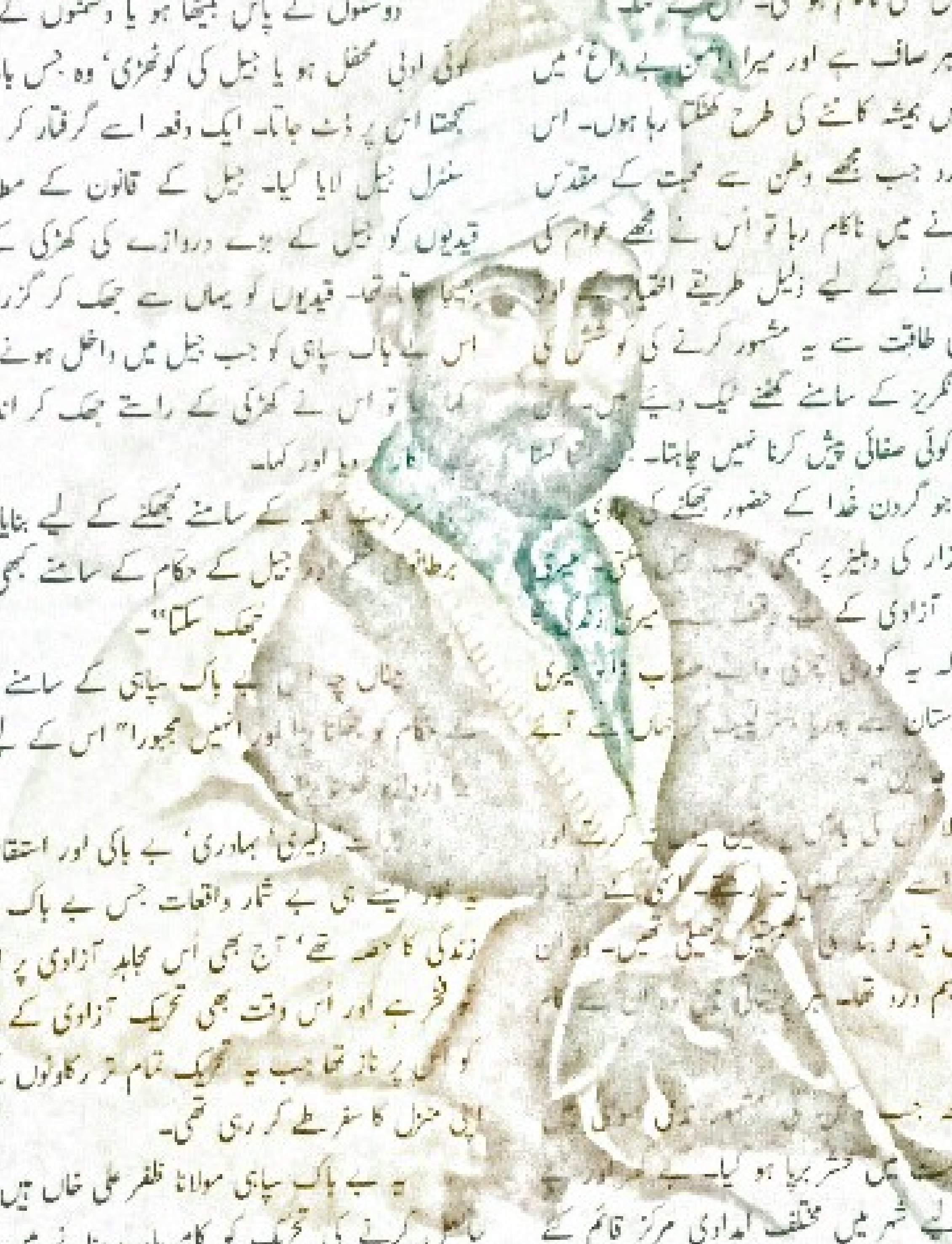

"میرا ضمیر صاف ہے اور میرا دامن بے داغ۔ میں انگریز کے دل میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہوں۔ اس کا ظلم اور تشدد جب مجھے وطن سے محبت کے مقدس راستے سے ہٹانے میں ناکام رہا تو اس نے مجھے عوام کی نظروں سے گرانے کے لیے ذلیل طریقے اختیار کیے اور عوام میں پوری طاقت سے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی کہ میں نے انگریز کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ اس سلسلے میں میں کوئی صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا۔ [illegible] کہنا چاہتا ہوں کہ جو گردن خدا کے حضور جھکنے [illegible] وہ برطانوی اقتدار کی دہلیز پر کبھی [illegible] میری حیات وطن کی آزادی کے [illegible] میری زندگی کا یہ مقصد ہے کہ یہ [illegible] میری زندگی میں ہندوستان [illegible] آتے ہیں' دہیں چلے [illegible]

عوام بھلا [illegible]

دل و جان سے [illegible] اس نے 15 برس قید و بند کی [illegible] جھیلی تھیں۔ وہ ان کا غم خوار اور ہمدرد تھا۔ [illegible] آتا تھا۔

ایک دفعہ جب [illegible] سیلاب آیا تو ریاست میں حشر برپا ہو گیا۔ [illegible] حال لوگوں کے لیے شہر میں مختلف امدادی مرکز قائم کیے گئے۔ افضل گنج کے علاقے کا انتظام' جہاں تقریباً" پچاس ہزار تباہ حال انسانوں کو ٹھہرایا گیا تھا' اس مخلص کارکن کے سپرد ہوا۔ اس نے نہایت ہمدردی اور سخت محنت سے مسلسل اٹھارہ دن یہ خدمت سرانجام دی۔ اس کے علاوہ اس قیامت خیز سیلاب کے بارے میں ایک نہایت پر تاثیر نظم "شور محشر" لکھی جسے ہزاروں کی تعداد میں چھاپا گیا اور اس کی آمدنی سیلاب زدگان کے لیے وقف کر دی گئی۔

دوستوں کے پاس بیٹھا ہو یا دشمنوں کے درمیان' کوئی ادبی محفل ہو یا جیل کی کوٹھڑی' وہ جس بات کو حق سمجھتا اس پر ڈٹ جاتا۔ ایک دفعہ اسے گرفتار کر کے لاہور سنٹرل جیل لایا گیا۔ جیل کے قانون کے مطابق تمام قیدیوں کو جیل کے بڑے دروازے کی کھڑکی کے راستے [illegible] جاتا تھا۔ قیدیوں کو یہاں سے جھک کر گزرنا پڑتا تھا اس بے باک سپاہی کو جب جیل میں داخل ہونے کے لیے [illegible] تو اس نے کھڑکی کے راستے جھک کر اندر جانے [illegible] دیا اور کہا:

"[illegible] کے سامنے جھکنے کے لیے بنایا گیا ہے برطانوی [illegible] جیل کے حکام کے سامنے کبھی نہیں جھک سکتا"۔

چناں چہ [illegible] بے باک سپاہی کے سامنے خود جیل کے حکام کو جھکنا پڑا اور انہیں مجبوراً" اس کے لیے جیل کا [illegible]

[illegible] دلیری' بہادری' بے باکی اور استقامت کے یہ تو چند ہی بے شمار واقعات جس بے باک سپاہی کی زندگی کا حصہ تھے' آج بھی اس مجاہد آزادی پر اہل وطن کو فخر ہے اور اس وقت بھی تحریک آزادی کے رہنماؤں کو اس پر ناز تھا جب یہ تحریک تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اپنی منزل کا سفر طے کر رہی تھی۔

یہ بے باک سپاہی مولانا ظفر علی خاں ہیں۔ پاکستان حاصل کرنے کی تحریک کو کامیاب بنانے میں آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اسی لیے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے 21 مارچ 1937ء کو شاہی مسجد لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"مجھے آپ اپنے صوبے میں مولانا ظفر علی خاں

مجھے دو چار بہادر آدمی دے دیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا"۔

علامہ اقبالؒ نے بھی مولانا کی خدمات کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔

"مولانا ظفر علی خاں ایک غیر معمولی دل و دماغ کے انسان ہیں۔ ان کی بلند ہمتی اور عزم و استقلال نے قوم میں ایک نئی روح ڈال دی ہے۔ ان کا قلم اپنی روانی میں دنیا کے بڑے بڑے مجاہدوں کی تلوار سے کم نہیں ہے"۔

ظفر علی خاں ایک فرد نہیں تھے، بلکہ ایک قوم اور ایک عہد کی تاریخ تھے۔ آپ کی ذات میں سینکڑوں ہنگاموں نے پرورش پائی، بیسیوں تحریکوں نے جنم لیا اور جہاد آزادی کو منزل تک پہنچایا۔ آپ 1290ھ (مطابق 1873ء) پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں جو سوہدرہ ریلوے اسٹیشن (تحصیل وزیر آباد) کے ساتھ واقع ہے، میں پیدا ہوئے۔ شروع میں آپ کا نام خداداد رکھا گیا تھا بعد میں ظفر علی خاں کے تاریخی نام سے بدل دیا گیا۔

آپ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شروع میں آپ کے بزرگ سیال کوٹ میں رہتے تھے۔ آپ کے دادا مولوی کرم الٰہی خاں نے وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ کے قریب بہت سی زمین خرید کر ایک نئی بستی آباد کی اور اپنے نام پر اس کا نام کرم آباد رکھا۔ یہ علاقہ پہلے بالکل ویران اور بنجر تھا اس لیے لوگ اسے دھپ سڑی (دھوپ میں جلی ہوئی) کہتے تھے۔ مولوی کرم الٰہی خاں نے اپنی محنت سے اسے بھاگ بھری بنا دیا۔

ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین احمد خاں محکمہ ڈاک و تار میں ملازم تھے۔ انہیں اسلام سے بہت محبت تھی اور مشرقی روایات سے گہرا لگاؤ تھا۔ ظفر علی خاں کی تعلیم و تربیت خاص اس ماحول میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انہیں علی گڑھ بھیجا گیا۔ بی اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد آپ حیدر آباد میں نظام فوج کے بہادر سپہ سالار نواب افسر الملک کے ماتحت فوج میں ملازم ہو گئے۔ سیر، شکار اور ورزش کا

شوق آپ کو شروع ہی سے تھا۔ علی گڑھ میں تعلیم سے دل چسپی کے علاوہ کھیل کے میدان میں بھی آپ نے خوب حصہ لیا۔ فوجی زندگی اختیار کرنے کے بعد اس شوق کو اور جلا ملی۔ شہ سواری اور نیزہ بازی میں آپ نے جلد ہی نام پیدا کر لیا۔

مولانا ظفر علی خاں کا سیر کا معمول بھی عجیب تھا۔ صبح سویرے کئی کئی کلومیٹر پیدل چلنا اور اتنا تیز چلنا کہ دوڑنے اور چلنے میں کوئی امتیاز باقی نہ رہتا۔ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ سیر کرنے کی کوشش کرتا تو تھوڑی دور چل کر حوصلہ ہار بیٹھتا۔ آپ کے ایک دوست سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ کے بارے میں کہا کرتے تھے "ہمارا لیڈر کیا ہے، طوفان میل ہے!"

1937ء میں جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں نئی روح پھونکی، تو ظفر علی خاں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور اپنے آپ کو مسلمانوں کی بیداری اور تنظیم کے لیے وقف کر دیا۔ 1937ء کے ایک ضمنی انتخاب میں لاہور سے مرکزی اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ 1946ء کے عام انتخابات میں وہ پھر اسی حلقے سے ووٹوں کی بھاری اکثریت سے منتخب ہوئے۔

مولانا ظفر علی خاں نے شعر، ادب، سیاست اور صحافت، سب میں بھرپور حصہ لیا اور ہر میدان میں اپنی ذہانت شوخی اور زندہ دلی کا لوہا منوایا۔ ظفر علی خاں مترجم بھی تھے اور مصنف بھی، ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، صحافی بھی تھے اور خطیب اور سیاست دان بھی۔ وہ ان سب میدانوں میں رہ رو نہیں تھے بلکہ رہ بر تھے۔ ایک ایسے رہ بر جو مصلحت اندیشی کو اپنا مسلک نہیں بناتا بلکہ حق گوئی و بے باکی کو اپنا شعار بناتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے اُردو صحافت کو جس طرح ترقی دی اس کی وجہ سے ان کو بابائے صحافت کہا جاتا ہے۔ ان کا اخبار زمیندار کھل کر حکومت اور ہندو پریس پر تنقید کرتا تھا۔

مولانا کی تحریروں نے برصغیر میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ مولانا کی قومی نظمیں زبان زدِ عام تھیں۔ ان کا یہ مشہور شعر اس زمانے میں ضرب المثل تھا۔

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تختہ جا آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا دل سرشار تھا۔ ان کا نعتیہ کلام قارئین کا دل موہ لیتا تھا۔ ان کی ایک نعت کے چند اشعار یہ ہیں۔

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی کُل دنیا کے درباروں میں

○

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے، بتلا دیا چند اشاروں میں

○

وہ جنس نہیں ایمان جسے، لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو، یہ قرآں کے سی پاروں میں

○

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

○

مولانا ظفر علی خاں نے مُلک کی آزادی اور اسلام کی سربلندی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ آپ نے حق گوئی اور راست بازی، جرأت اور بے باکی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنی پوری زندگی ان پاکیزہ مقاصد کے حصول کے لیے وقف کر دی تھی۔ آپ نے 27 نومبر 1956ء کو علی الصبح وفات پائی اور اپنے آبائی گاؤں کرم آباد میں دفن ہوئے۔ مولانا آزاد نے آپ کی وفات پر سچ ہی کہا تھا۔

"وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا ہے جس میں اس قسم کے آدمی ڈھلا کرتے تھے"۔

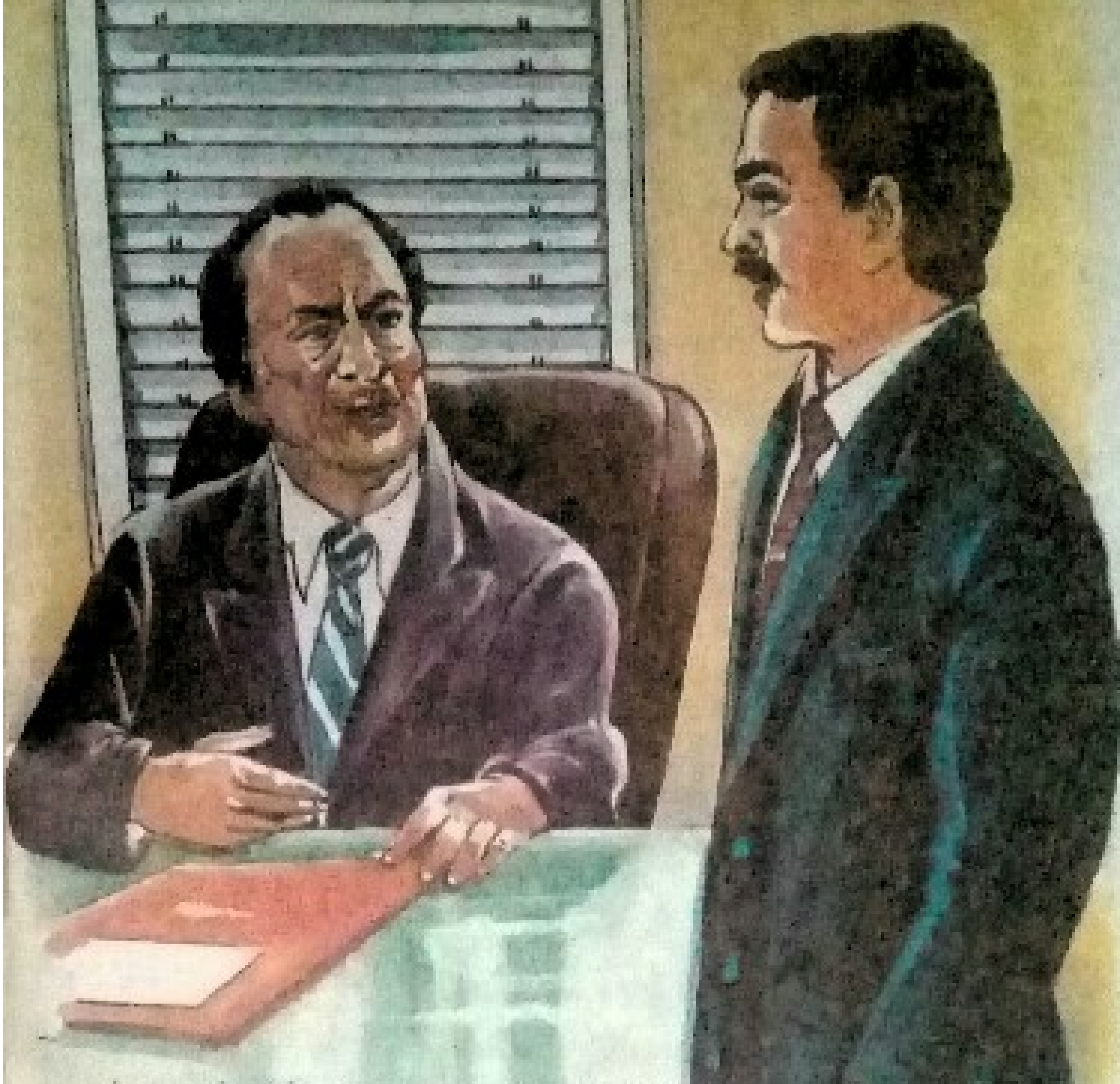

ڈائریکٹر جنرل لاہور' انٹیلی جنس اوپریشنز (ایل آئی او) احمد خان بندیال اپنے کمرے میں انتہائی غصے میں بیٹھا تھا۔ اس نے سہیل خان کو بلوایا تھا جو آئی او کا فیلڈ انسپکٹر تھا اور بڑا لائق اور محنتی خیال کیا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کا پچھلے 10 سال کا ریکارڈ بہت ہی اچھا تھا۔ اس نے کئی بڑے بڑے غدار پکڑے تھے۔ آئی او کے سارے افسر اس پر فخر کرتے تھے اور مشکل سے مشکل کام سرانجام دینے کے لئے اس کی ڈیوٹی لگاتے تھے۔

گورا چٹا' لمبے اور مضبوط جسم کا مالک سوٹ بوٹ پہنے سہیل خان ڈائریکٹر جنرل کے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈائریکٹر جنرل کا منہ غصے سے سوجا ہوا تھا۔

"بیٹھو" ڈائریکٹر جنرل بندیال نے کہا۔

"شکریہ سر" وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا اور بندیال کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

"مجھے افسوس نہیں غصہ ہے آپ پر" ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔

"وہ تو سر آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔ آپ کا چہرہ سرخ ہے' غصے سے" سہیل خاں بولا۔

"اس معاملے میں کیا ہو گیا تم کو" بندیال نے پوچھا۔

"کس معاملے میں سر؟" سہیل نے ڈائریکٹر جنرل سے پوچھا۔

"بشیر بیگ کے معاملے میں' اور کس کے معاملے میں"۔

"سر' بات یہ ہے کہ بشیر بیگ کے قلعہ نما گھر سے آزاد کشمیر پلان (اے کے پی) حاصل کرنا میرے لئے ناممکن ہے" سہیل خان نے صاف صاف بتا دیا۔

"اب کے کیوں مشکل ہے۔ آپ کے لئے' سہیل خان؟" اس بار بندیال صاحب کی آواز میں غصہ کم تھا۔

"سر' بشیر بیگ کا گھر' صرف گھر نہیں قلعہ ہے۔ اونچی اونچی پختہ اینٹ کی دیواریں سر کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ ان کے اس قلعہ نما گھر کا ایک بڑا دروازہ ہے جو فولاد کا بنا ہوا ہے۔ ایک چور دروازہ ہے جو لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اور اس کے پاس ہٹے کٹے چار چوکی دار ہیں جن کے پاس روسی کلاشن کوفیں ہیں۔ وہ پہلے ہی اس شخص کو بھون چکے ہیں جس پر بڑے گیٹ کے چوکی دار کو شبہ تھا کہ وہ چور ہے۔ ان چار چوکی داروں کے علاوہ تین اور

ہتھیار بند جوان ہیں جو چادر کی ٹکل مار کر گھر کے اردگرد باری باری چکر لگاتے رہتے ہیں۔ یہ آٹھ آٹھ گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ دن رات کے 24 گھنٹے آنے جانے والوں کو تاڑتے رہتے ہیں۔ سر، آخری بات یہ ہے کہ بشیر بیگ کے گھر کی مشرقی جانب بڑ کا درخت ہے جس میں فلڈ لائٹ فٹ ہے۔ دن کو تو سورج کی روشنی میں بڑ کے درخت کا تنا نظر آتا ہے اور رات کو فلڈ لائٹ بڑ کے درخت کو روشنی کا مینار بنا دیتی ہے۔ اب آپ مجھے بتائیں اس گھر کے اندر داخل ہونے کے لئے کون سی چال چلوں۔ فرمایئے"۔

بندیال نے سہیل خاں کی بات سنی۔ تھوڑی دیر چپ رہا پھر سوچ کر بولا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ بشیر بیگ نے اتنا سخت حفاظتی بندوبست کر رکھا ہے۔ میرا خیال تھا ایک آدھ چوکی دار ہو گا۔ سات ہتھیار بند چاق و چوبند چوکی دار تو نری تباہی ہیں۔ وہاں تو پرندہ بھی پر مارنے سے رہا"۔

"جی سر، بشیر بیگ کے گھر داخل ہونا واقعی اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے"۔

"کوئی ترکیب ہے ذہن میں؟ یہ کام بہت ضروری ہے۔ لازمی ہے۔ جنرل نے لکھ کر حکم دیا ہے کہ بشیر بیگ کے گھر سے وہ فہرست حاصل کی جائے جس پر اُن لوگوں کے نام اور پتے درج ہیں، جن کے ذریعے وہ بھارت کے لئے معلومات حاصل کرتا ہے"۔

"اور انڈیا سے پیسے لیتا ہے سر"۔

"آف کورس، یہ ساری تفصیل موجود ہے۔ فہرست اور پلان کے ساتھ"۔

"کوئی بڑا رجسٹر ہو گا سر؟"

"نہیں رجسٹر نہیں ہے۔ ایک باریک ورقوں والی کاپی ہے۔ یہ ساری معلومات کاپی پر ہیں مگر جب مشن ناممکن ہے تو پھر ان باتوں کا ذکر کیوں؟" ڈائریکٹر جنرل جھنجلا کر بولا۔

"سر، اگر آپ ناراض نہ ہوں تو آخری سوال پوچھ لوں؟" سہیل خاں نے کہا۔

بندیال صاحب بولے "پوچھو، ضرور پوچھو مگر یہ نہ پوچھنا کہ بھارت آزاد کشمیر پر کب حملہ کرے گا۔ کیوں کہ یہ بات بشیر بیگ کے پلان میں ہے"۔

"سوال یہ ہے سر، اگر کاپی مل جائے تو محکمے کو کیا فائدہ ہو گا؟"

"فائدہ؟ بھئی بہت فائدہ ہو گا۔ ایک یہ کہ بشیر بیگ کے خلاف ثبوت مل جائے گا۔ کیوں کہ اے کے پلان اُس نے خود بنا کر بھارتی صدر کو بھیجا ہے۔ اس کا ثبوت موجود ہے۔ کاپی پر اندراج اس کے اپنے ہاتھ سے کیا ہوا ہے۔ دوسرا، ان لوگوں کو پکڑنے میں آسانی ہو گی جو اس کے ایجنٹ ہیں۔ یوں بشیر بیگ کا جاسوسی کا جال ٹوٹ جائے گا۔ وہ گرفتار ہو گا۔ بھارت ناکام ہو گا۔ تیسرے یہ کہ میں بیسویں گریڈ سے اکیسویں گریڈ میں چلا جاؤں گا یعنی میری ترقی ہو جائے گی"۔

"یہ تو آپ کا بھلا ہوا، محکمے کا بھلا ہوا اور قوم کا بھلا ہوا کہ غداری اور جاسوسی کی لعنت ختم کرنے میں مدد ملے گی۔ میرا بھی کچھ ہو گا یا نہیں؟"

"محکمہ کی طرف سے آپ کو دس لاکھ روپے اور تعریفی سند ملے گی۔ یہ فیصلہ ہو چکا ہے یعنی جنرل صاحب نے لکھ کر دیا ہے کہ جو افسر پلان کی کاپی لا کر دے گا اسے دس لاکھ روپے اور سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ سرٹیفکیٹ وزیر دفاع کی طرف سے ہو گا"۔

"اب بالکل آخری سوال سر" سہیل خان نے آخری سوال کیا "پلان کے لیے کتنی بار کوشش ہوئی"۔

"دوبار کوشش کی گئی۔ پہلی بار تو انسپکٹر ٹونی بشیر بیگ کے آدمیوں سے جان بچانے میں کام یاب رہا۔ دوسری بار انسپکٹر عبدالغفور ورک جان نہ بچا سکا۔ جس

مشکوک آدمی کا تو نے ذکر کیا اور جو مارا گیا وہ عبدالغفور ورک ہی تھا۔ کوئی چور اچکا نہ تھا"۔

سہیل خان نے دوسری بات نہ کی۔ وہ کرسی سے اُٹھا، پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ شدہ کاغذ کھول کر ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس اوپریشنز کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" ڈائریکٹر جنرل نے پوچھا "یہ تو درخواست ہے چھٹی کی"۔

"جی ہاں، مجھے تین ماہ کی چھٹی چاہیے"۔

"چھٹی نہیں مل سکتی۔ تین ماہ کیا چھٹی تو ایک دن کی بھی نہیں مل سکتی آپ کو"۔

"میں نے تو پچھلے دس سال کے دوران میں تین ماہ کی چھٹی نہیں لی۔ ہاں ایک ایک دو دو دن کی اتفاقیہ رخصت لی ہے۔ وہ بھی اس وقت جب میرا بیٹا شیر خاں بیمار تھا"۔

"میں جانتا ہوں لیکن میں چھٹی نہیں دے سکتا۔ آپ کو متعلقہ ڈائریکٹر چھٹی دے گا"۔

"سر، اگر یہ بات تھی تو مشن کے بارے میں پچھلے ڈیڑھ گھنٹا سے آپ بات کر رہے ہیں وہ بھی متعلقہ ڈائریکٹر ہی کرتے۔ آپ نے کیوں زحمت کی"۔

"میں نے جو بات آپ سے کی ہے اس کا علم آپ کے ڈائریکٹر کو نہیں۔ ٹونی اور ورک کے متعلق بھی اُسے علم نہیں ہے۔ ٹونی نے حلف اُٹھایا تھا کہ کسی سے بات نہیں کرے گا۔ ورک اللہ کو پیارا ہو گیا اور موت کی وجہ حادثہ قرار پائی۔ آپ سے جو بات ہوئی ہے وہ کسی دوسرے نے نہیں سُنی۔ آپ بھی اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ ہاں، 3 ماہ کی رُخصت منظور ہو جائے گی۔ لیکن یہ بتاؤ یہ اچانک تین مہینوں کی چھٹی کیوں لینا چاہتے ہو؟"

"مشن ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے سر"

"گویا آپ کو معلوم تھا کہ میری اور آپ کی گفت گو اس نتیجے پر پہنچے گی جس نتیجے پر اب پہنچی ہے یعنی مشن کی تکمیل ممکن نہیں"۔

"جی ہاں، مجھے معلوم تھا۔ ورک نے موت کے مشن پر جانے سے پہلے مجھے بتا دیا تھا۔ وہ میرا گہرا دوست تھا۔ اللہ اُسے جنت میں جگہ دے"۔

"آمین۔ اگر چھٹی کی منظوری کے متعلق میں نہ مانتا تو مشن ناممکن کو ناممکن ہی رکھنے کے لیے تم ورک کا ذکر کرتے یا نہ؟"

"میں ورک کا نہیں، ورک کی موت کا ذکر کرتا۔ ورک کی موت بہت بڑی دلیل ہے کہ بشیر بیگ کے گھر سے آزاد کشمیر پلان چوری نہ کیا جائے"۔

"لیکن اب یہ تین مہینے کی چھٹی لے رہے ہو اسی پلان کو حاصل کرنے کے لیے۔ کیوں؟"

"اس لیے کہ ورک میرا دوست تھا۔ اُسے بشیر بیگ نے قتل کیا۔ میں دوست کی موت کا بدلہ یوں لینا چاہتا ہوں کہ وہ اور اُس کا جاسوسی کا کاروبار اور اُس کے کاروباری دوست سب تباہ و برباد ہو جائیں۔ یوں میرے دل کو قرار اور ورک کی روح کو سکون نصیب ہو گا"۔

"گویا آپ ملک و قوم یا محکمے کے لیے اس مشن پر نہیں جا رہے ہیں۔ ذاتی انتقام کے لیے جا رہے ہیں"۔

"ذاتی انتقام نہیں۔ دوست کی موت کا انتقام"۔

"آپ کی چھٹی منظور ہے"۔

"تین مہینوں کے لیے سر؟"

"جی ہاں، تین مہینوں کے لیے آپ کو چھٹی دی جاتی ہے۔ خدا حافظ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے"۔

"تھینک یو سر" سہیل خان نے کہا اور احمد خاں بندیال کے کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ جب ڈائریکٹر جنرل کے پاس سے اُٹھ کر آیا تھا تو اپنی میز کی درازوں کو تالا لگا کر آیا تھا۔ یہ پے ڈے تھا

اور اس نے پچھلے مہینے کی تنخواہ بھی وصول کر لی تھی۔
چناں چہ وہ اپنے دفتر سے کسی سے بات کیے بغیر نکلا اور فین روڈ سے ہوتا ہوا لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر آگیا جسے انگریز مال روڈ کہتے تھے۔ وہ ریگل چوک میں گل فروشوں کی دکانوں کی طرف مڑ گیا اور ایک دکان کے پاس کھڑے ہو کر لال پیلے اور کالے گلاب دیکھنے لگا۔

گلاب کے پھولوں کی خوش بو اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ پھول بیچنے والوں کی دکانوں پر اور بھی کئی قسم کے پھول تھے۔ ان کی خوش بو بھی گلاب کے پھولوں کی خوش بو سے گلے مل رہی تھی۔ سہیل خاں نے اپنے آپ کو رنگوں اور خوش بوؤں کے میلے میں محسوس کیا۔

"بھلا ہو بابو، کچھ مل جائے، جانور بھوکا ہے" سہیل کے پیچھے ایک فقیر کی آواز ابھری۔

وہ پلٹا۔ سامنے میں پچیس سال کا میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک جوان کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں بندر کی ڈوری تھی۔

"یہ ہے تیرا جانور قلندر؟"

"ہاں بابو، یہ بھوکا ہے۔ میں بھی بھوکا ہوں۔ صبح سے کچھ نہیں ملا۔ کچھ دے دو بھلا ہوگا" وہ بولا۔

"کہیں تماشا دکھایا ہوتا" سہیل نے کہا۔

"بندر کا تماشا کوئی نہیں دیکھتا۔ ہر کوئی ٹیلی وژن دیکھتا ہے لاہور میں"۔

"گاؤں جا کر تماشا دکھایا کر"۔

"وہاں بھی ریڈیو اور ٹیلی وژن پہنچ گیا ہے۔ لوگ گانے سنتے ہیں۔ بندر کا تماشا کوئی نہیں دیکھتا"۔

سہیل خان نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور قلندر کو دے کر بولا "جاؤ جا کر خود نان چھولے کھاؤ اور اسے ایک پاؤ دودھ پلاؤ"۔

"بابو جی، یہ اب دودھ نہیں پیتا، پھل کھاتا ہے۔ جب چھوٹا تھا تب دودھ پیتا تھا۔ اب اسے سیب، امرود اور کیلے کھانے کا چسکا ہے"۔

سہیل خان نے دس روپے کا ایک اور نوٹ نکالا اور قلندر کو دے دیا۔ بندر نے سہیل کو دیکھا اور خوشی سے کھی کھی کرنے لگا "یہ آپ کا شکریہ ادا کر رہا ہے بابو" قلندر نے ہنس کر کہا۔

"کیا نام ہے تیرا قلندر بھائی" سہیل نے اس کا نام پوچھا۔

"بابو جی میرا نام راجا ہے۔ میں امامیہ کالونی شاہدرہ میں پل کے نیچے جھونپڑی میں رہتا ہوں۔ میرے پاس بکری اور کتا بھی ہے لیکن آج میں صرف شہزادے کو لے کر آیا ہوں"۔

"تو بندر کو شہزادہ کہتا ہے نا"۔

"ہاں بابو جی' یہ میرا شہزادہ ہے۔ میرے کتے کا نام ٹینڈو ہے اور بکرے کو ہم ہیرو کہتے ہیں"۔

"اچھا دوست پھر ملیں گے" سہیل نے کہا اور جنرل پوسٹ آفس کی طرف پیدل چل دیا۔

اس نے سوچا۔ "بچے دو ہیں' ایک بیٹی اور ایک بیٹا وہ اور ان کی ماں تحصیل شکر گڑھ کے گاؤں جلالہ شریف میں اس کی امی کے پاس ہیں۔ گھر میں ایک نوکر ہے جو گائے کو چارہ ڈالتا ہے اور دوہتا ہے۔ گھر میں کافی اناج ہے۔ گاؤں کا نمبردار اس کا بڑا بھائی ہے جو اس کے خاندان کا ہر طرح خیال رکھتا ہے۔ اگر وہ بشیر بیگ کی کاپی حاصل کرتے ہوئے مر بھی جائے تو اس کے بچے بے سہارا نہ ہوں گے۔ اس کی ماں' اس کی بیوی اور اس کا بھائی ان کا خیال رکھیں گے"۔

یہی سوچتے ہوئے وہ جنرل ڈاک خانے کی عمارت میں داخل ہوا اور منی آرڈر کرنے والے کلرک سے فارم لے کر پر کرنے لگا۔ اس نے سو روپے روز کے حساب سے ایک مہینے کے لیے تین ہزار روپے کا منی آرڈر اپنی بیوی کنیز بیگم کے نام جلالہ شریف کے پتے پر ارسال کیا۔

وہ انار کلی کی سیر کرتا ہوا لوہاری دروازے کے قریب گیا اور پھر رکشے میں بیٹھ کر کریم پارک آیا۔ یہاں اس کا دو کمرے کا گھر تھا۔

منا برتن دھو کر قاعدہ پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سہیل نے کہا "منے میاں' سبق یاد کیا یا مار کھاؤ گے"۔

"سبق یاد ہے۔ ابھی سن لیں"۔

"سنتا ہوں۔ ذرا کمر سیدھی کر لوں" سہیل خان نے کہا اور بستر پر لیٹ گیا۔

منا 7 سال کا بچہ تھا جو اس کے پاس رہتا تھا۔ گھر کے برتن مانجھتا اور اس کے لیے بازار سے چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر لاتا تھا۔ یہ یتیم بچہ تھا جو وہ ملتان روڈ کے ایک یتیم خانے سے لایا تھا اور اپنا بیٹا بنا کر اس کا خیال رکھتا تھا۔ اسے خود ہی پڑھاتا تھا۔ منے کا اصل نام شبیر تھا اور وہ چنگڑ برادری سے تھا۔

شام کو سہیل خاں نے سبق سنا۔ منے کو سبق یاد تھا۔ سبق سننے کے بعد اس کو اگلا سبق پڑھایا اور پھر گھر سے نکل کر امامیہ کالونی کی طرف چل دیا۔ اسے قلندر کا ڈیرا جو پل کے نیچے تھا' تلاش کرنے میں دیر نہ لگی۔ قلندر نے سہیل کو چائے بنا کر دی جس میں پتی کم اور شکر زیادہ تھی۔

"بابو جی' آپ نے کہا تھا آؤں گا اور آپ آ گئے۔ آپ نے وعدہ پورا کیا"۔

بندر نے اسے پہچان لیا تھا اور وہ کھی کھی کر کے ہنس رہا تھا۔

"یہ آپ کو کہہ رہا ہے۔ بسم اللہ' بسم اللہ"

"شکریہ شہزادے۔ ٹینڈو اور ہیرو کہاں ہیں؟" سہیل نے پوچھا۔

"وہ دوسری جھونپڑی میں ہیں۔ میرے بھائی کے پاس"

"میں شہزادے کو لینے آیا ہوں' کتنے پیسے لو گے؟" سہیل نے پوچھا۔

"آپ سمجھا۔ آپ شہزادہ خریدنے آئے ہیں۔ میں نے مری کے جنگل سے اسے ایک سال پہلے تین سو روپے میں خریدا تھا۔ اسے کھلایا پلایا اور پالا پوسا۔ اب آپ سے ایک ہزار روپے لوں گا۔ زیادہ نہیں۔ ویسے یہ ڈیڑھ ہزار روپے کا جانور ہے"۔

"پیسے کچھ کم نہیں ہو سکتے قلندر میاں؟"

"بابو جی، میں نے تو پہلے ہی پانچ سو روپے کم کر دیے ہیں۔ اس لیے کہ آپ جی دار آدمی ہیں"۔

"شہزادہ سب کچھ سیکھ چکا ہے یا سیکھ رہا ہے؟"

"ابھی تو یہ سیکھ رہا ہے۔ سیکھنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا"۔

"سیکھنے میں کیسا ہے یہ؟"

"بہت تیز ہے۔ جلدی بات سمجھ لیتا ہے۔ نہ سمجھے تو ایک بار کان مروڑنے سے پھر غلطی نہیں کرتا۔ ابھی دکھاتا ہوں"۔

قلندر نے شہزادے کو پاس بلایا اور کہا "بابو جی کو سلام کرو" قلندر نے حکم دیا

شہزادے نے پیر جوڑ کر اور ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

"بابو جی کہتے ہیں مر جاؤ" اب قلندر نے ایک بار پھر ہدایت کی۔ بندر زمین پر چپ گم لیٹ گیا۔ گویا مر گیا!

"بس بس، کافی ہے اتنا" سہیل نے کہا اور ایک ہزار روپے قلندر کو دیے۔ بندر کی ڈوری پکڑی اور شام کی تاریکی میں سڑک پر ہو لیا۔ ایک رکشے والے کو ہاتھ دیا اور 30 روپے کرایہ طے کر کے کریم پارک آ گیا۔

گھر آ کر اس نے منے کو تیس روپے دیے اور کہا پھل والے سے کیلے سیب اور امرود لاؤ۔ کچھ اپنے لیے اور کچھ بندر کے لیے۔ گھر میں وہ پہلے سے موجود تھا۔

بندر کے آنے سے منا بہت خوش تھا!

سہیل ایک مہینے تک شہزادے کو سکھاتا رہا کہ چوری کیسے کی جاتی ہے۔ جب اس سے کوئی غلطی ہوتی تو اس کے کان اینٹھتا اور درست عمل دہراتا۔ غلطی کی درستگی ہو جاتی۔ جو کام کروانا ہوتا، وہ سب سے پہلے منے سے کہتا کہ کرو۔ منا کام کرتا۔ بندر اسے دیکھتا اور پھر اس کام کو دہراتا۔ غلطی ہو جاتی تو اس کے کان مروڑے جاتے اور پھر وہی عمل دہرانے کے لیے کہا جاتا۔

ایک ماہ کے اندر شہزادہ چوری کرنے میں ماہر ہو گیا۔ اسے چابی لگانا بھی سکھا دیا گیا تھا۔ چابیوں کا گچھا اسے تھما دیا جاتا اور وہ باری باری چابی لگا کر دیکھتا اور سوراخ میں چابی گھماتا۔ اگر ایک چابی اٹک جاتی تو دوسری آزماتا۔

ایک دن سہیل خان شہزادے کو لے کر تھانہ شفیق آباد گیا۔ وہاں بڑا تھانے دار جاوید اقبال ورک تھا۔ وہ نہ ملا۔ اس کا کمرا خالی تھا۔ چابیوں کا گچھا جیب سے نکال کر سہیل نے شہزادے کو دیا اور اس نے ورک کی دراز کھول کر ایک رجسٹر نکالا۔ دراز بند کی اور رجسٹر منہ میں پکڑ کر

سہیل کے پاس آگیا۔ سہیل نے شہزادے کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ رخصت کا دوسرا مہینا گزر گیا۔ اندھیری راتیں آگئیں۔ سہیل کی داڑھی بڑھ گئی تھی۔ وہ دن رات بشیر بیگ کے پلان کے متعلق سوچتا رہتا تھا اور بندے کو لے کر شہزادے کی تربیت بار بار کرتا تھا تاکہ کوئی کسر باقی نہ رہے۔ واردات کی رات سے پہلے وہ تین دن تک میلے کچیلے قلندروں والے کپڑے پہن کر بندے اور شہزادے کے ساتھ بشیر بیگ کے قلعہ نما مکان کے سامنے صبح شام گھومتا رہا تاکہ گیٹ کیپر اور چوکی دار قلندر، بندر اور قلندر کے بچے کو دیکھ لیں اور وہ تینوں چوکیداروں، گھر کے حدود اربعہ اور بڑ کے درخت سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

واردات کی اس خاص رات کو آدھی رات کے بعد تین بجے اس نے شہزادے کو بڑ کے درخت پر چڑھنے کے لیے کہا۔ اس کی ایک شاخ گھر کی بڑی دیوار پر گرتی تھی۔ سہیل نے چابیوں کا گچھا شہزادے کو دیا تھا جسے وہ منہ میں پکڑے ہوئے تھا۔ سہیل نے پھر دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شاخ پر سے ہو کر دیوار پر آیا اور پھر چھت پر چلا گیا۔ چھت سے سیڑھی کے ذریعے نیچے آیا اور کمروں میں گھوم کر دیوار میں دھنسی ہوئی الماری تلاش کی۔ یہ الماری تیسری منزل کے ایک کونے والے کمرے میں دیوار میں پیوست تھی۔ شہزادہ الماری کو سونگھنے لگا پھر اس نے چابیوں کا گچھا ایک ہاتھ سے اٹھایا اور الماری کے سوراخ میں ایک ایک کر کے چابی گھمانے لگا۔ دس چابیاں تھیں۔ وہ دس کی دس چابیاں گھما چکا لیکن الماری نہ کھلی۔ قریب تھا کہ وہ غصے میں آجاتا لیکن اسے اپنے استاد کا ڈنڈا یاد آیا۔ اس نے ایک بار پھر نئے سرے سے چابی گھمائی۔ تالا کھل گیا۔ الماری میں دو خانے تھے۔ منجھلا خانہ خالی تھا۔ اوپر والے خانے میں ایک سنہری کاپی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کاپی اٹھائی اور پھر منہ میں دانتوں کے ذریعے مضبوطی سے گرفت میں لی۔ چابیوں کو وہیں چھوڑا۔ الماری بند نہ کی اور ادھر ادھر چوروں کی طرح دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ دبے پاؤں اوپر آیا۔ پھر اور اوپر گیا اور آخر کار اس دیوار پر چڑھ گیا جس کے ساتھ بڑی شاخ ملی ہوئی تھی۔ اسے شاخ پر چڑھتے ہوئے سہیل خان دیکھ رہا تھا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی شہزادے کو دیکھ نہ لے۔

"شاباش میرے شہزادے" اس کے منہ سے نکلا "شہزادہ پتوں میں سے ہوتا ہوا سہیل کے پاس آ گیا۔ سہیل نے کاپی اپنی ناف کے اوپر ڈوری سے باندھی۔ کپڑے درست کیے اور شہزادے کے گلے میں ڈالی ہوئی ڈوری پکڑ کر قلندروں کی سی چال چلتا ہوا گیٹ کی طرف چل دیا"۔

"کون ہے بے اس وقت؟" ایک چوکی دار للکارا۔

"خیر ہو صاحب کی۔ آپ کا قلندر ہوں۔ مولا کرم کرے" سہیل خان بولا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جاؤ صبح ہوئی نہیں اور چل پڑے مانگنے کے لیے، کمینے"۔ چوکی دار نے آدھی بات سہیل خان سے کی اور آدھی اپنے آپ سے۔

وہ دونوں مزے سے چلتے ہوئے مال روڈ پر آگئے اور ایک کھوکھے میں بیٹھ کر سہیل خاں چائے پینے لگا اور اس نے جیب سے کیلا نکال کر شہزادے کے سامنے رکھا۔

دوسرے دن بشیر بیگ اور اس کے وہ تمام ایجنٹ جو معلومات اکٹھی کر کے اسے دیتے تھے اور وہ آگے انڈیا کو بیچتا تھا، گرفتار ہو گئے۔ بشیر بیگ کی گرفتاری کے سبب اس کا آزاد کشمیر پر بھارتی حملے کا منصوبہ بھی خاک میں مل گیا۔

سہیل خاں کو دس لاکھ روپے ملے اور تعریفی سند جو وزیر دفاع کی طرف سے تھی۔ آج کل سہیل خاں اور شہزادہ جلال شریف میں رہتے ہیں۔

آپ کا خط ملا

اس دفعہ یکم مئی کو میں 13 سال کا ہو گیا ہوں اور جب میں نے تعلیم و تربیت پڑھنا شروع کیا تھا تو اس وقت میری عمر 9 سال تھی۔ رابن سن کروسو دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ انکل! کھیلوں کی دنیا' ختم کر کے "مجرم کون" شروع کر دیں۔ (حسن اکبر' بیدیان)

سالنامہ بہت شان دار تھا۔ آزمائش' ایک شیر کی کہانی' روبن سن کروسو اور السلام علیکم بہت پسند آئیں (عمران اللہ خان گنڈہ پور)

سالنامہ واقعی بہت شان دار تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی اور معیاری تھیں۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی وفات کا پڑھ کر دل افسوس ہوا۔ سائنس فکشن کا سلسلہ بہت پسند آیا۔ (عفت جہاں پشاور)

سالنامہ پسند آیا۔ خاص طور پر سرورق پر شیر میسور (ٹیپو سلطان) کی تصویر بہت ہی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ٹیپو سلطان پر مضمون پڑھ کر بے اختیار اس شیر دل انسان کو خراج تحسین پیش کرنے کو دل چاہا جس نے اپنا مقولہ سچ کر دکھایا اور اپنا سر کٹوا دیا لیکن اسے انگریزوں کے آگے جھکنے نہیں دیا۔ صفحات بہت ہی کم تھے اس لحاظ سے خاص نمبر اور عام شمارے میں بالکل فرق نہیں تھا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اس کے صفحات 100 کرتے اور قیمت 20 روپے رکھتے۔ کیونکہ سالنامہ سال میں صرف ایک بار شائع ہوتا ہے۔ بار بار نہیں۔ (محمد سعید رضا خاکوانی' بورے والا)

سالنامہ بہت پسند آیا۔ سرورق بھی بہت عمدہ تھا۔ سائنس فکشن اور کارٹون کہانی بہت پسند آئیں (محمد شکیل دیپال پور)

سالنامہ بہت شان دار تھا۔ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ آیئے مسکرائیں میں لطائف کی تعداد زیادہ کریں (محمد قاسم اویس راول پنڈی چھاؤنی)

مئی کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں اچھی تھیں سائنس فکشن کے آغاز کا سن کر خوشی ہوئی۔ کھیلوں کی دنیا میں جو بھی کھیل دیں اس کے ٹورنامنٹوں کی تفصیل بھی دیا کریں۔ "آزادی نمبر" کا سن کر خوشی ڈبل ہو گئی (چوہدری محمد امتنان چاہل فیصل آباد)

میری آپ سے گزارش ہے کہ کھیلوں کی دنیا میں کسی کھلاڑی کا انٹرویو شائع کیا جائے (عمر عظمت شیخ' اقبال ٹاؤن لاہور)

سرورق بہت عمدہ تھا۔ کہانیوں میں جن ناموں کا تحفہ' روبن سن کروسو' بڑھیا کی گڑیا' اور 45 منٹ کی کہانی' بہت اچھی تھیں۔ ایک شیر کی کہانی واقعی ایک عظیم شیر کی کہانی تھی۔ ماشاء اللہ تعلیم و تربیت کا معیار روز بروز بڑھتا جا رہا ہے (عمران جعفری' جلال پور پیر والا)

تمام کہانیاں لطائف اپنی مثال آپ تھے۔ تعلیم و تربیت کا معیار روز بروز بلند ہوتا جا رہا ہے۔ خدا کرے یہ ترقی جاری و ساری رہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین (عالیہ' ظہیر ملتان)

سالنامہ ہر لحاظ سے نمبر ون تھا۔ مجھے نیا سلسلہ سائنس فکشن بہت پسند آیا ہے۔ اسے جاری رکھا جائے (میمونہ انجم لاہور)

سالنامہ بہت پسند آیا۔ سرورق بہت ہی جاذب نظر تھا۔ اور کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ سائنس فکشن شروع کر کے تو آپ نے ہمارے دل موہ لیے ہیں۔ آیئے مسکرائیں اور آپ کا خط ملا بہت اچھے سلسلے ہیں آپ ان کو زیادہ مختصر نہ کریں۔ مجاہدین آزادی میں "ایک شیر کی کہانی" ایک زبردست کاوش تھی۔ قائد اعظم کلاسک کی تیسری قسط بہت اچھی تھی۔ میری ایک رائے ہے کہ قائد اعظم کلاسک ختم ہونے کے بعد آپ علامہ اقبال کلاسک شروع کریں۔ اگست کا شمارہ "آزادی نمبر" ہو گا۔ یہ اعلان سن کر تو ہم خوشی سے پاگل ہو گئے۔ آپ بھی لکھنے میں ادیبوں کی تصویریں بھی ضرور شائع کریں (محمد شاہد حفیظ الہ آبادی' میلسی)

ناول بہت زبردست تھا اور ناول کہانی بھی اچھی لگی اور قائد اعظم کلاسک تو اپنی مثال آپ تھا (عفت شیر گروسندر کراچی)

بھائی جان' اگست 97 کے تعلیم و تربیت کے صفحات 120 ہونے چاہئیں بے شک قیمت جتنی آپ کی مرضی ہو' کر دیں۔ (سجاد احمد تنولی ایبٹ آباد)

سرورق پر نظر ڈالی تو دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ یہ پڑھ کر خوشی کے مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں کہ اگست کا شمارہ (محمد نجیم عباس بوزا لدھیال سرگودھا)

اتنا اچھا سالنامہ پیش کرنے پر مبارک باد۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ آیئے مسکرائیں پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ بھائی جان' آپ نے کارٹون کہانی کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ بہت ہی اچھا ہے اسے جاری رکھیں۔ (عمارہ نورین لاہور)

مئی کا سالنامہ دیکھتے ہی میں خوشی سے جھوم گئی اور میری خوشی اس وقت دوچند ہو گئی جب میں نے یہ پڑھا کہ اگست کا شمارہ "آزادی نمبر"

ہو گا۔ آپ سب اتنا اچھا سالنامہ شائع کرنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

تعلیم و تربیت دن بہ دن ترقی کرتا جا رہا ہے۔ تمام تحریریں بے انتہا دل چسپ ہوتی ہیں روز بہ روز ترقی کر کے بہت اچھی جا رہی ہے۔ سائنس فکشن "کا سلسلہ شروع کر کے آپ نے بہت اچھا کیا۔ کھیلوں کی دنیا میں اس دفعہ فٹ بال کو جگہ دینی چاہیے (گل محمد دانش دریا خان)

بھائی جان! اس دفعہ کا رسالہ 'زبردست مزے دار' چٹخارے دار اور میٹھا تھا لیکن اپنا نام نہ پا کر بڑی مرچیں لگیں (شیر نواز گل ارمڑ یابان)

اس دفعہ کا ٹائٹل ہر دفعہ کے ٹائٹل کی طرح بہت خوب صورت تھا۔ کہانیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ نظمیں بھی لاجواب تھیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ ہونہار فوٹو گرافر شروع کیا جائے اور لطائف کے لیے دو صفحے مخصوص کریں نیز ایک صفحہ شعروں کا بھی ہونا چاہیے (عرفان چشتی ننکانہ صاحب)

اس شمارے میں آپ نے کارٹون کہانی شائع کی اس کا بہت بہت شکریہ۔ بھائی جان' رسالے کو دو پنیں لگایا کریں کیوں کہ رسالہ جلدی پھٹ جاتا ہے۔ (صدف شہزادی مورگاہ راول پنڈی)

اس دفعہ سرورق نہایت ہی اچھا بنایا گیا ہے۔ تعلیم و تربیت کا یہ انداز مجھے بے حد پسند ہے کہ یہ اپنے اسلاف کے کارنامے ہمیں یاد کرواتا ہے۔ سب سے اچھی کہانی ایک شیر کی کہانی تھی (یاسر ملک ڈڈیال)

بھائی جان' ویسے یہ سالنامہ تھا لیکن مجھے جتنی امیدیں اس سے وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ لطیفے پڑھ کر رونا آ رہا تھا۔ آپ نے اتنے کم لطیفے دیے تھے باقی صفحہ اتار نہیں کر دیا تھا کہ پڑھ کر ذرا مزا نہ آیا۔ کارٹون کہانی کا نام "تضاد" ہونا چاہیے تھا (ناصر سعید لاہور)

بھائی جان' میں تعلیم و تربیت کا بہت زیادہ فین ہوں۔ مجھے تعلیم و تربیت کی ہر کہانی اچھی لگتی ہے۔ مجھے خاص طور پر محمد یونس حسرت ڈاکٹر رضوان ثاقب اور سلیم خان گمی کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں (فریحہ احمد فیصل آباد)

سالنامہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اتنا اچھا شمارہ ترتیب دینے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ تمام کہانیاں اور سلسلے اچھے تھے۔ خاص طور پر آزمائش 'السلام علیکم' چاکلیٹ '45 منٹ کی کہانی' آزادوادی 'جن ماموں کا تحفہ اور ایک شیر کی کہانی' پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ آپ کا خط ملا' ہونہار مصور اور باعنوان اچھے سلسلے ہیں۔ (مہوش رفیق ملک' ملتان)

تمام کہانیاں اور نظمیں لاجواب تھیں۔ رسالے کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کیونکہ اس کا معیار روز بروز بڑھ رہا ہے (آمنہ بتول قدسیہ گوجرہ)

مئی کا شمارہ سالنامہ تھا لیکن جب اندر سے دیکھا تو پتا چلا کہ صفحات صرف 72 ہیں آپ نے صرف 4 صفحات بڑھائے جب کہ میں سمجھا تھا کہ کم از کم 100 صفحات ہوں گے۔ آپ نے حد ہی کر دی۔ اس سے بہتر تھا کہ آپ 3 روپے بڑھا دیتے اور کم از کم 100 صفحے رکھتے۔ صرف 4 صفحے بڑھا دینے سے تو رسالہ سالنامہ نہیں بن جاتا۔ آزادی نمبر کا سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اب آپ سے گزارش ہے کہ آزادی نمبر کے صفحے کم از کم 100 رکھیں۔ کھیلوں کی دنیا سلسلے کو بہتر بنانے کے لیے جو کھیلیں ہو رہی ہیں ان کے بارے میں خبریں دیا کریں (امیر راحیل پرویز' مظفر آباد)

میں گزشتہ ماہ سے رسالے میں خط لکھنا چھوڑ گیا تھا لیکن مئی کے سالنامے نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ اس دفعہ کا سالنامہ نمبر ون تھا۔ آپ آیندہ ماہ سلسلہ مجرم کون شروع کرنے کی خوشخبری دیں۔ محمد الیاس خواجہ جلال پور پیر والا)

میرے پیارے تعلیم و تربیت!

آداب عرض

سب سے پہلے تو قبول میری طرف سے ڈھیروں مبارکباد

ماشاءاللہ تم دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہو اور رسالوں کے درمیان چاند کی مانند چمک رہے ہو اللہ کرے تم ایسے ہی ترقی کی منازل طے کرتے رہو (آمین)

[illegible]

(آمنہ یوسف لاہور)

مئی 97ء کا دھماکہ خیز شمارہ ملا۔ دھماکہ خیز اس لیے کہا کہ آپ ہر ماہ کوئی نہ کوئی خوش خبری سنا رہے ہیں۔ تمام تحریریں لاجواب تھیں۔ (تنویر احمد، راولپنڈی)

تعلیم و تربیت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے البتہ بلاعنوان کی جگہ "مجرم کون" شروع کریں۔ (رحمت اللہ فاروقی گنڈہ پور، ٹونہ)

تمام کہانیاں اچھی تھیں لیکن آزادوادی، بڑھیا کی گڑیا، چاکلیٹ اور آزمائش بہت پسند آئیں۔ (نعیم مسعود چوہدری، دہاڑی)

نئے سلسلے سائنس فکشن نے سالنامے کو چار چاند لگا دیے۔ کارٹون کہانی کو جاری رکھا جائے۔ (ظہیر عباس کشمیری، ڈھیر امید علی شاہ)

سب کہانیاں اے ون تھیں۔ کارٹون کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ اس کو جاری رکھیں۔ آپ نے آیئے مسکرائیں میں کارٹون بنا کر بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔ تعلیم و تربیت اس وقت عروج پر ہے (عمر خورشید درانی، لاہور)

سالنامہ ہمیں یہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لطائف میں اتنی زبردست تبدیلی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ کھیلوں کی دنیا کو ختم کرکے لطائف کے صفحات میں اضافہ کرنا چاہیے۔ کارٹون کہانی کا سلسلہ اچھا لگا۔ اس سال تو تعلیم و تربیت نے ہمارے لیے اطفال نمبر بھی شائع کیا۔ سالنامہ بھی شائع کیا اور اب آزادی نمبر بھی شائع کرنے والا ہے۔ اگر اس سال کو تعلیم و تربیت کا سال کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا (سموم احسن، چشمہ)

سالنامہ توقع سے زیادہ خوبصورت نکلا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں (محمد ندیم علی رضا منہاس، شاہدرہ)

کہانیوں میں محمد یونس حسرت کی اژدہے کی بکری، ڈاکٹر رضوان ثاقب کی ایک شیر کی کہانی، علیم خان گمی کی آزادوادی بہت پسند آئیں۔

(ماجد خان جمالی، کراچی)

سالنامہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ملا۔ اس کا ایک ایک لفظ تعریف کے قابل ہے۔ نیا سلسلہ سائنس فکشن شروع کرنے کا شکریہ۔ اداریہ پڑھ کر ہماری باچھیں کھل گئیں کہ اگست کا شمارہ آزادی نمبر ہوگا۔ ہم سوچنے لگے کہ آخر ایسا کیا ماجرا ہوا کہ آپ کو "خاص نمبر" نکالنے کا خیال آگیا۔ خیر ہمیں تو آم کھانے سے مطلب ہے نہ کہ..... ہماری دعا ہے کہ آپ اس طرح خاص نمبر نکال کر تعلیم و تربیت کو نمایاں کرتے جائیں۔ (محمد ساجد انصاری، ڈنگہ)

اتنا زبردست سالنامہ نکالنے پر میری طرف سے مبارک باد۔ کس کس کہانی کی تعریف کروں تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لطائف بھی بہترین تھے۔ نئے سلسلے سائنس فکشن نے بہت اہم معلومات فراہم کیں۔ بھائی جان، اگر باتیں بڑوں کی یا بیت بازی میں سے کوئی سلسلہ شروع کر دیں تو مزہ ہی جائے (غلام شبیر راجپوت، کوٹ ادو)

مئی کا دل چسپ شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ کھیلوں کی دنیا ہر ایک کا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ پلیز اسے جاری رہنے دیں۔

اس دفعہ سرورق واقعی بہت خوب صورت تھا۔ ایک شیر کی کہانی بہت ہی اچھی تھی۔ اس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ مضمون لکھنے کا یہ انداز نہایت اچھا ہے۔ ڈاکٹر اور روبوٹ میں ذکی صاحب نے نہایت دل چسپ طریقے سے روبوٹوں کی تاریخ بیان کی ہے۔ کہانی کے آخر میں مصنف نے جو بات بتائی ہے وہ نہایت ہی فکر انگیز ہے۔ انسان چاہے جتنی مرضی مشینیں اور روبوٹ بنالے لیکن وہ پھر بھی دنیا بنانے والے رب کی بنائی ہوئی چیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جن ماموں کا تحفہ بھی نہایت دل چسپ تھی۔ اس دفعہ ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب نے "فضول خرچیوں کے خلاف جہاد" لکھ کر واقعی جہاد کیا ہے۔ بڑھیا کی گڑیا میں محترمہ نجمہ معراج نے ایک ننھی منی خواہش کو نہایت ہی اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا بچیوں کا حق ہے جس سے روکنا ان کا حق چھیننے کے مترادف ہے۔ محترمہ بخت رسا کی کہانی حسب معمول بہت ہی اچھی تھی۔ کھیلوں کی دنیا اور آیئے مسکرائیں بھی بہت دل چسپ تھے لیکن لطائف بہت ہی کم ہو گئے ہیں۔ اتنے کم لطائف؟ مجھے تو یہ بھی ایک لطیفہ ہی لگتا ہے۔ لطائف کے کم از کم دو صفحے ہونے چاہئیں۔ اس دفعہ خطوط بہت دل چسپ تھے۔ ہونہار مصور اور آپ بھی لکھیے بہت اچھے تھے۔ بلاعنوان کارٹون کا سلسلہ بہت بور لگتا ہے۔ اس کو بند کر کے کوئی نیا سلسلہ شروع کریں۔ مٹے کا مٹھو نظم بہت پیاری تھی۔ کارٹون کہانی نے بہت لطف دیا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس کو مستقل کر دیں۔ آپ نے سنہری چڑیا پر مضمون لکھ کر اچھی روایت ڈالی ہے۔ ایسے عظیم لوگوں کو اس طرح ہی خراج تحسین پیش کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر واقعی بہت عظیم انسان تھے۔
عبدالستار خان طاہر

(تابندہ فرح منظور جو گیر خان، ڈانیوال)

پچھلے ماہ خط لکھا تھا لیکن آپ نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ خیر ہم ناراض نہیں ہیں۔ بھلا اتنے اچھے رسالے سے کون ناراض ہو سکتا ہے۔ سالنامہ اپنی مثال آپ تھا۔ (ملک محمد سجاد، محمد شریف والی)

سالنامہ بہت شان دار تھا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں بہت اچھی تھیں۔ البتہ آپ بھی لکھیے میں کہانی مسلسل محنت (عبدالوحید احمر، چک نمبر 117 ج۔ب رحمون) نقل شدہ ہے۔ ثبوت کے لیے تراشہ ساتھ بھیج رہی ہوں (عمارہ روف، ملتان)

٭ عبدالوحید احمر کو بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔

ہونہار مصور

گرمی کا موسم

محمد شکیل، شیخوپورہ (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

آسیہ تبسم، بہاول پور (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

نازلی صنم، اسلام آباد (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

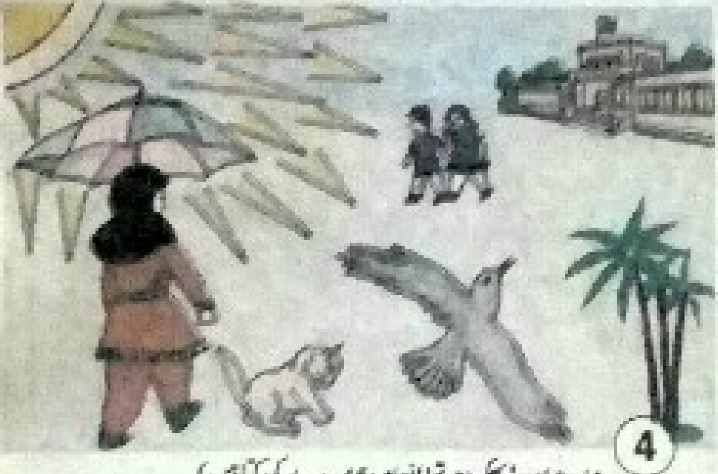

مجاہد عباس، بھکر (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

فرحانہ شکیل، کراچی (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

شہرینہ ناز، راول پنڈی (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: سعدیہ فاروق ڈیرہ اسماعیل خان۔ زاہد حسن خان فیصل آباد۔ سمیعہ اسلم گوجرہ۔ سعد علی راول پنڈی چھاؤنی۔ محمد عمر طیب لاہور۔ زبیر الحق چیچہ وطنی۔ ساجدہ محمود ملک لاہور۔ سعدیہ ملک لاہور۔ محمد ارشد ڈھڈیوالہ۔ انعم بشارت سرگودھا۔ شیر نواز گل ارمڑیان۔ محمد عثمان طیب لاہور۔ سمیعہ نور لاہور۔ کرن اسلم بہاول پور۔ فرحانہ محمود راول پنڈی۔ حمیرا حسین لاہور۔ احسن رضا گل لاہور۔ وردہ صفدر سرگودھا۔ بشریٰ اقبال سرگودھا۔ شاہد اقبال اوکاڑہ۔ محمد عثمان خاور بورے والا۔ عبد الغفار ڈھڈیوالا۔ محمد ایوب خاور بورے والا۔ رابعہ اسحاق نوری لاہور۔ افتخار عزیز لاہور۔ سیدہ آصف کراچی۔ سدرہ مسعود کاموں کی۔ حنا بتول کراچی۔ عفت بشیر کراچی۔

آخری تاریخ 7 جون

ہدایات: [illegible]

آخری تاریخ 7 جولائی

کارٹون کہانی

ملاں نصیرالدین کے لالچ کا انجام

شاہد ریاض

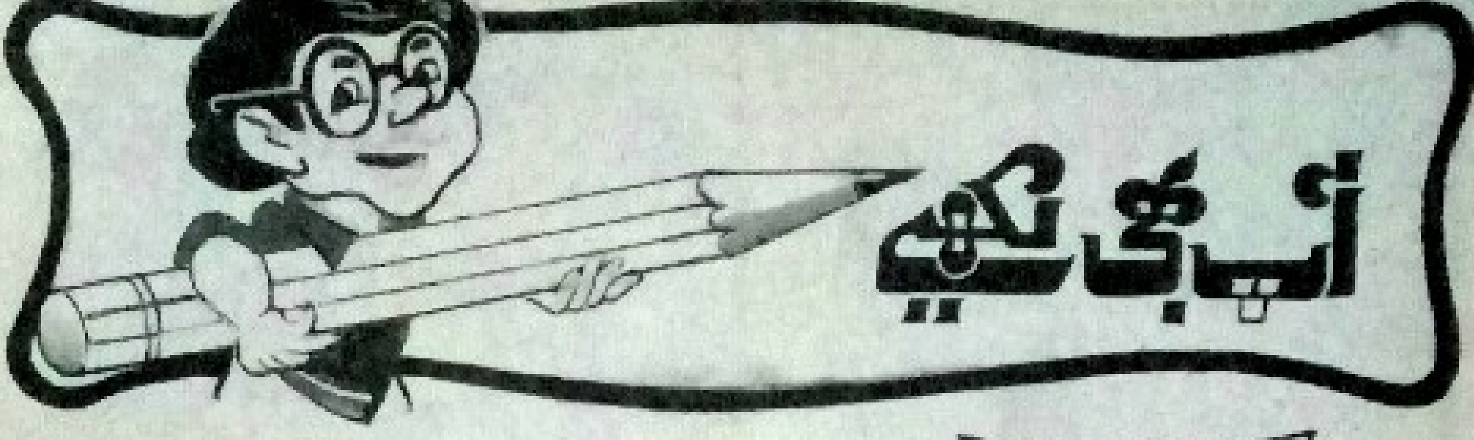

شامت

محمد اویس، لالہ رخ واہ چھاؤنی

ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ ابھی سارہ باجی کی شادی میں ایک ہفتہ باقی تھا لیکن ہم نے امی جان اور لاہور والی خالہ سے بہانے وانے لگا کر اور کچھ ڈرامے بازی کر کے کسی نہ کسی طرح بابر، شوکت اور شہری کو پہلے ہی یہاں بلوا لیا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ انہیں شادی کے کاموں کے لیے بلوایا گیا تھا بلکہ انہیں بلوانے کا مقصد ایک مسئلے کا حل تھا اور وہ مسئلہ تھا "خالہ نصیبو"۔ ہم چاہتے تھے کہ جو مسئلہ ہمیں خالہ نصیبو کی ذات سے درپیش ہے اس کا حل باجی کی شادی سے پہلے ہی ہو جائے کیوں کہ ہم میں سے کوئی بھی اس بات پر رضامند نہیں تھا کہ شادی کے دوران میں بھی ہمیں ویسی ہی باتوں کا سامنا کرنا پڑے جن کا سامنا کرنا ہمارا روز مرہ کا معمول تھا۔

خالہ نصیبو کی آمد اور محلے کے بچوں اور خاص طور پر ہماری شامت کا آغاز تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ہوا تھا۔ وہ واقعی اپنے نام کی طرح نصیبوں والی تھیں۔ کیوں کہ ان کی شاید ہی ایسی کوئی خواہش ہو جو پوری نہ ہوئی ہو۔ البتہ ان کی سب خواہشات ان بچوں سے وابستہ ہوتیں جنہوں نے کبھی اپنے گھر والوں سے ڈانٹ یا مار نہ کھائی ہو۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی بچہ بھی بغیر ڈانٹ یا مار کھائے سیدھے راستے پر چل نکلے اور کل کو خالہ یہ کہہ نہ سکیں کہ اس کام یاب بچے کا سبب میں ہوں۔

"اتنی دوپہر کو گلی میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ کھیلنے کا وقت ہے؟ آج اسکول کیوں نہیں گئے؟ کہاں سے آ رہے ہو؟" ایسے اور اس قسم کے دوسرے بہت سے سوال تھے جن کا ہر بچے سے پوچھنا خالہ کے مشن کا خاص حصہ تھا۔ غضب یہ کہ وہ ان سوالوں پر ہی بس نہیں کرتی تھیں بلکہ ان سب باتوں کو بچوں کے والدین کے گوش گزار کرنا بھی وہ اپنا فرض اول سمجھتی تھیں۔

شروع میں تو ہم سب خالہ کی ان باتوں کو برداشت کرتے رہے لیکن بعد میں میں نے اور سعد نے اس بات کا پکا ارادہ کر لیا کہ کسی طرح خالہ کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ تفتیشی افسر کے عہدے سے مستعفی ہو جائیں اور بچوں کی حمایت کے محکمے کو جوائن کر لیں۔ چاہے اس کے لئے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑے۔ ہم نے اپنے اس مشن کی تکمیل میں اپنی خالہ کے تینوں بیٹوں کو شامل کرنا بھی مناسب سمجھا۔ جن کے ساتھ مل کر ہم ایک عرصے سے مشکل سے مشکل مسائل حل کرتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں پر میں خالہ نصیبو کے اس بے وقوف سے لڑکے کا بھی ذکر کرتا چلوں جو خالہ کا سیکرٹری تھا اور وہ باتیں جو خالہ کی نظر سے بچ جائیں ان کا خالہ کو بتانا اس کے ذمے تھا۔

خیر جناب جب بابر، شوکت اور شہری واہ آ گئے تو ہم نے مل کر ایک کابینہ ترتیب دی اور ایک دن ہم سب اپنے گھر کی پچھلی بالکونی میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اپنے مشن کی تکمیل پر غور کرنے لگے۔ ہماری اسی بالکونی کے سامنے خالہ نصیبو کے گھر کی بالکونی تھی جس میں ان کی بیٹھک کا دروازہ کھلتا تھا۔ بہت ساری تجویزیں پیش کی گئیں اور بہت سے منصوبے سوچے گئے۔ اس سے پہلے کہ میٹنگ برخاست ہوتی خالہ کی بیٹھک کا دروازہ کھلا اور ہاشی (خالہ نصیبو کا بیٹا) باہر آیا۔ وہ بہت خوش لگ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ وہ جلدی سے ہماری طرف آنے

لگا- "اسے کیا ہوا ہے؟"

"دیکھتے ہیں" میں نے جواب دیا-

"دیکھو تو' شاویز انکل نے میرے لئے دبئی سے کیمرہ بھیجا ہے" وہ ہماری آنکھوں کے سامنے کیمرے نچانے لگا-

"واہ بھئی بہت پیارا ہے- تم ایسا کرو یہاں بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں اور تمہارا کیمرہ دیکھتے ہیں- میں نے سب کی طرف آنکھ دباتے ہوئے کہا اور ہم سب "فوراً" وہاں سے ہوا ہو گئے- لیکن ہوا وہی جس کا ڈر تھا- شام کو خالہ نے امی جان کو بتا دیا کہ بچے تپتی دوپہر میں بالکونی میں بیٹھے کوئی نئی شرارت کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے- ہمیں باشی پر شدید غصہ آیا- بہرحال ہم نے بھی آج پہلی بار اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ کیا اور طے یہ پایا کہ موقع پا کر خالہ کی بالکونی میں بجلی کے میٹر کے ساتھ لگے بجلی کے فیوز نکال لئے جائیں اور ان سب کو اتنی سخت گرمی میں مچھروں سے میچ کھیلنے دیا جائے-

اگلی شام کو سعد نے ہمیں بتایا کہ خالہ کوئی سودا وغیرہ لینے بازار گئی ہیں- ان کے ہاتھ میں ٹوکری اور تھیلے وغیرہ تھے اور یقیناً ایک آدھ گھنٹے تک واپس آئیں گی- اتنی دیر میں منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے- ہم نے فوراً" ہی موقع اچھا سمجھ کر کام شروع کر دیا- اپنی بیٹھک سے چھوٹا سا اسٹول اٹھایا اور خاموشی سے خالہ کی بالکونی میں میٹر کے عین نیچے رکھ دیا- سعد اور شوکت کو باہر پہرے پر کھڑا کر دیا اور شہری کو اوپر چڑھنے کے لئے کہا گیا لیکن وہ نہ مانا- مجبوراً" مجھے چڑھنا پڑا- بابر اور شہری اسٹول پکڑ کر کھڑے ہو گئے- بورڈ کا زنگ آلود دروازہ بڑی مشکل سے کھلا- ابھی میں فیوز نکالنے ہی لگا تھا کہ روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور میں نے فوراً" ہاتھ پیچھے کھینچ لیا- "کیا ہوا" بابر اور شہری گھبرائی ہوئی آواز میں بولے-

"پ پ..... پتا نہیں" میں نے معصوم بن کر کہا-

"تو پھر جلدی کرو" ان دونوں نے غصے سے کہا- میں نے ہمت کر کے فیوز کھینچ لیا اور پھر جلدی جلدی دروازہ بند کر کے نیچے اترا اور ہم اسٹول اٹھا کر گھر بھاگ آئے- ہم سب کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے اور پھر فوراً" ہم امی سے اجازت لے کر بابر' شوکت اور شہری کو گھمانے کے بہانے باہر نکل گئے- تاکہ شبے کی گنجائش نہ رہے کہ یہ کام ہمارا کیا دھرا ہے-

رات کو کھانا کھا کر ہم جلد ہی سو گئے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہوا- صبح سویرے کچھ بلند آوازوں سے ہماری آنکھ کھل گئی- یہ صحن میں خالہ نصیبو تھیں جو امی سے بلند آواز میں باتیں کر رہی تھیں- ہم سب دبکے رہے اور پھر شاید وہ چلی گئیں لیکن ہماری شامت چھوڑ گئیں- امی نے ہم سب کو انتہائی غصے میں بلایا اور بغیر کچھ کہے ایک تصویر ہمارے سامنے رکھ دی- میرا تو دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا- وہ میری تصویر تھی جس میں میں فیوز اتارنے کی کوشش کر رہا تھا- اگر اس وقت مجھے کچھ یاد آ رہا تھا تو وہ تھا باشی اور اس کا کیمرہ جو اس کے انکل نے دبئی سے بھیجا تھا اور روشنی کے اس جھماکے کا راز بھی شاید وہی تھا جو فیوز اتارتے ہوئے اچانک ہوا تھا (پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں- محمد اویس اپنا پورا پتا لکھیں)

قصہ ہمارے دانت کا

ارم بتول' واپڈا کالونی چشمہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم بہت چھوٹے تھے- خیر اتنے بھی چھوٹے نہ تھے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں- مگر تھے چھوٹے ہی- میری کلاس میں ایک لڑکا پڑھتا تھا- نام تو اس کا رومی تھا مگر سب اسے ہم "اکو بادشاہ" کہتے تھے- وہ بڑا فضول منہ پھٹ اور شرارتی تھا- ہم تو ہم پورا اسکول اس کی شرارتوں سے تنگ تھا-

یہ صاحب عموماً" اس وقت تشریف لاتے جب کلاسز شروع ہو چکی ہوتیں- استاد صاحب لیٹ آنے پر ڈانٹتے تو موصوف نہایت آرام سے فرماتے "تو' سر کیا آپ میرا انتظار نہیں کر سکتے تھے؟ بندے کو دیر سویر ہو ہی جاتی ہے"-

موصوف کو بطور سزا دو مرتبہ کلاس میں مرغا بنایا گیا- لیکن رومی میاں سزا پروف تھے- ان پر اس سزا کا کوئی اثر نہ ہوا- ہمارے ایک دودھ کے دانت نے ہمارے ناک میں دم کر رکھا

تھا۔ ہلتا تو ایسے لگتا جیسے منہ میں جھکڑ چل رہے ہوں۔ مگر ٹوٹنے کا نام نہ لیتا۔ ایک دن ہم اسی دانت کو سنبھالے اسکول چلے گئے اور چپ چاپ کلاس کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔

ادھر روبی صاحب پتا نہیں کہاں سے ٹپک پڑے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہم چپ چاپ منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں تو سوچا کہ ہم ضرور کوئی چیز تناول فرما رہے ہیں۔ بس جناب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ہمارے منہ پر رکھے ہاتھ پر جھپٹ پڑے۔ ہم اس ناگہانی آفت سے بچنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ اچانک میرا دوسرا ہاتھ بھی منہ پر لگا۔ ہمارے دانت صاحب پھرتی سے باہر جا گرے۔ پھر کیا تھا' ہم نے شور مچا دیا "ہائے میرا دانت توڑ دیا روبی نے"۔

دانت ٹوٹنے سے ہماری تکلیف تو دور ہو گئی مگر یہی تکلیف روبی میاں کے گلے جا پڑی۔ استاد صاحب نے اس کا جو حال بنایا کچھ نہ پوچھیے۔ البتہ ہمیں بہت داد ملی کہ کتنا بہادر بچہ ہے' دانت ٹوٹنے پر ذرا بھی نہیں رویا (دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

قیامت صغریٰ

ریحان سرور' محسن آباد لاہور

یہ 22 اگست 1996ء کی ایک ابر آلود شام تھی۔ میں اور میرا بھائی پاکستان اور انگلستان کا ٹسٹ میچ دیکھ رہے تھے۔ یہ میچ کا پہلا دن تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب بوندا باندی رکی تو میں کھیلنے چلا گیا۔

شام سات بجے میں واپس آیا اور پھر میچ دیکھنے لگا۔ رات دس بجے کے قریب میچ ختم ہوا اور ہم ٹی وی بند کر کے کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ بارہ بجے کے قریب جب ہم سوئے تو بارش دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ یہ پہلے سے قدرے تیز تھی۔ اگلے دن جمعہ تھا اور ان دنوں جمعے کو چھٹی ہوتی تھی اس لیے میں صبح کافی دیر تک سویا کرتا تھا۔ مگر اس دن میری آنکھ گھر میں افراتفری کے باعث جلد کھل گئی۔ گھر کے تمام افراد بڑے پریشان ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔

"ارے کیا بات ہے؟ کوئی میری بات ہی نہیں سن رہا" میں نے کہا۔

"یہ رات سے ہونے والی مسلسل بارش کا نتیجہ ہے" ایک کمرے سے بڑی بہن کی آواز ابھری۔

"تو اب کیا ہو گا۔ اوپر کی منزل میں تو صرف ایک بھائی کا کمرا اور برساتی ہے" میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ صوفے وغیرہ پلنگوں پر رکھ کر ٹی وی' ریفریجریٹر وغیرہ اوپر کے کمرے میں رکھ دیتے ہیں اور خود برساتی میں چلے جاتے ہیں" ابو جو دروازے میں کھڑے پانی کی اونچائی کا اندازہ کر رہے تھے' نے کہا۔

یہ تجویز قابل عمل تھی۔ چنانچہ ایک گھنٹے کے اندر جب پانی ہمارے گھر میں داخل ہونے لگا تو ہم یہ تمام کام کر کے برساتی میں بیٹھے مینہ برستا دیکھ رہے تھے۔ بارش کو روکنے کے لیے مسجدوں میں اذانیں شروع ہو چکی تھیں اور اب بارش بھی رک گئی تھی۔ مگر اسی دوران میں محلے کا سب سے اونچا گھر ہونے کے باوجود ہمارے گھر میں 8 انچ کے قریب پانی داخل ہو چکا تھا۔ ہمارے پلنگوں کی زمین سے اونچائی ایک فٹ ہے۔ اگر پانی 4 انچ اور بڑھتا تو پلنگوں پر پڑی چیزیں اس کی زد میں آ جاتیں۔ ہمارا سارا دن اسی طرح چھت پر کھڑے دعائیں کرتے گزرا۔ رات وہیں برساتی میں سوئے۔ ایک آدمی کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ سیڑھیوں پر بیٹھ کر سامنے مین گیٹ پر نظر رکھے جو کھلا پڑا تھا۔ چنانچہ میں نے اور میرے بھائی نے سیڑھیوں میں بیٹھ کر وہ رات باری باری جاگ اور سو کر گزاری۔ ہمارے ہاتھوں میں ٹارچ تھی۔ آدھی رات کے وقت جب ہم نے پہلی بار ٹارچ جلا کر پانی کا جائزہ لیا تو یہ کافی حد تک نیچے جا چکا تھا۔ صبح تک پانی گھر سے نکل گیا مگر گلیاں اور سڑکیں خشک ہوتے ہوتے دو دن سے کم عرصہ نہ لگا۔

اس واقعے کو کافی عرصہ گزر چکا ہے مگر آج بھی جب وہ تصور ذہن میں ابھرتا ہے تو خوف کے مارے جان نکل جاتی ہے۔ اللہ ہر کسی کو ایسے عذاب سے بچائے (آمین) (تیسرا انعام: 40

روپے کی کتابیں)

ناقابل فراموش دن

محمد فاروق منیر' لاہور

6 مارچ کی صبح ہم افراتفری میں تیار ہوئے۔ ان دنوں ورلڈ کپ 96ء پورے زور شور سے جاری تھا۔ آج پاکستان اور نیوزی لینڈ کا میچ تھا۔ ہم جلد ہی قذافی اسٹیڈیم جا پہنچے۔ یہاں کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ لوگوں کا رش اتنا زیادہ تھا کہ اسٹیڈیم ان کی بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ ہر گیٹ کے اوپر اتنی لمبی قطار لگی ہوئی تھی کہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ کہاں سے شروع ہوئی ہے اور کہاں ختم ہو گی۔

ہم بھی قطار میں کھڑے ہو گئے اور گئے اس وقت کو کوسنے جب ہم نے میچ دیکھنے کا سوچا تھا۔ یہاں عجیب بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص کسی نہ کسی طرح اسٹیڈیم کے اندر داخل ہونے کی فکر میں تھا۔ کوئی پولیس والوں کے ساتھ چکر چلا کر اندر گھس رہا تھا۔ کوئی پیچھے سے دھکے دے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر ہمیں بھی جوش چڑھا اور ہم دھکا پارٹی میں شامل ہو کر اسٹیڈیم کے اندر پہنچ گئے۔

میچ ابھی شروع نہیں ہوا تھا لیکن تماشائی خوب شور مچا رہے تھے۔ اس سارے ہنگامے میں سرسبز چمکتا ہوا گراؤنڈ' لہراتے ہوئے پاکستانی پرچم' رنگ برنگی کرسیوں والے انکلوژر ایک ایسا سماں باندھ رہے تھے جو بہت خوبصورت تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر وہاں بیٹھ گئے جہاں سے پورا گراؤنڈ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میچ شروع ہو گیا۔ پہلی بیٹنگ پاکستان کی تھی۔

جونہی عامر سہیل اور سعید انور گراؤنڈ میں بلے لہراتے داخل ہوئے پورا اسٹیڈیم تالیوں کی گونج سے لرزنے لگا۔ اور پھر جب عامر نے ڈینی موریسن کو پہلا چوکا رسید کیا تو سارے تماشائی اٹھ کر ناچنے لگے۔ کچھ نے باجے بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اسی اثنا میں میری ایک بینر پر نظر پڑی جس پر لکھا ہوا تھا "مار پیارے مار"۔

تھوڑی دیر بعد سبز کپڑوں اور سفید ٹوپی میں ملبوس "شارجہ کا بابا" میچ دیکھنے آ پہنچا..... جی ہاں یہ وہی بزرگ تھے جو شارجہ میں میچ کے دوران میں اکثر ٹی وی پر مفلر پکڑے مخصوص انداز میں ناچتے نظر آتے۔ اب جو لاہوریوں کے ہتھے چڑھے تو زمین پر پاؤں نہ رکھ سکے۔ لڑکوں نے انہیں کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ بابا جی لڑکوں کے اوپر ہی اوپر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ لاہوریوں نے انہیں خوب نچایا اور وہ تھک ہار کر ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میچ جاری تھا۔ عامر سہیل نے کئی بولروں کو نگنی کا ناچ نچایا تھا مگر سعید انور ابھی ٹھنڈا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد عامر سہیل آؤٹ ہوا تو اعجاز احمد بلا گھماتا اندر داخل ہوا۔ ہمارے انکلوژر کی طرف جب بھی کیمرے کا رخ ہوتا لوگ اس طرح اٹھتے جیسے انہیں بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ پورے اسٹیڈیم کا یہی حال تھا۔ تماشائی پاکستانی پرچم لہراتے' پلے کارڈ اور بینر کیمرے کو دکھاتے اور اچھل اچھل کر تالیاں بجاتے تھے۔

دوسری طرف پاکستانی بیٹس مین کیویز کی ٹھکائی کرنے میں مصروف تھے اور انہوں نے 262 اسکور بنا ڈالے۔ عامر سہیل' سعید انور اور وسیم اکرم نے اچھی بیٹنگ کی۔ جب نیوزی لینڈ والوں کی باری آئی تو تماشائی اودھم مچا کر تھک چکے تھے لہٰذا تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے اور پھر پاکستان بڑی آسانی سے یہ میچ جیت گیا۔ ہم اس میچ کی ناقابل فراموش یادیں لے کر گھر واپس آ گئے اور گھر آتے ہی اپنی گلی میں اپنا ورلڈ کپ شروع کر دیا

(چوتھا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ادارت ایک دن کی

سائرہ رؤف' لاہور

ساتھیو' یہ کہانی جو آپ ابھی پڑھ رہے ہیں یہ ہماری ایک

دن کی ادارت کی کہانی ہے۔ ہوا یوں کہ ایک دن ہمیں ایک رسالے کی ادارت کا اعزاز مل گیا یہ ادارت صرف ایک دن کے لیے تھی۔ ہم آپ کو یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ایک دن کی ادارت کے دوران میں ہم پر کیا گزری؟

جب ہم گردن اکڑائے اڈیٹری کرسی پر بیٹھ گئے تو ہم نے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ وہ یہ کہ جو لکھنے والے اپنی تحریریں شائع کروانا چاہتے ہیں وہ خود اپنی تحریریں لے کر ہمارے دفتر میں آئیں۔ تاکہ ہم تحریر لکھنے والوں کے سامنے ہی تحریر پڑھ کر فیصلہ کردیں۔

"یہ لیجیے" ایک لڑکی نے کاغذ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"ایک دل چسپ قصہ" اس نے کہا۔

"دل چسپ" ہم آنکھیں پھاڑ کر قصے میں دل چسپی تلاش کرنے لگے۔ اگر دلچسپ قصے ایسے ہوتے ہیں تو پھر بد مزہ اور روکھے پھیکے قصے کیسے ہوتے ہیں؟" ہم نے دردناک لہجے میں سوال کیا۔

"آپ اس کی دلچسپی کو محسوس کرنے کی کوشش تو کریں" لڑکی نے کہا۔

"اچھا! ارے نظر آگئی دل چسپی' مل گئی دل چسپی" ہم چلائے۔

"کہاں کہاں دل چسپی محسوس ہوئی آپ کو؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

جہاں ختم شد لکھا ہے' اس چھوٹے سے لفظ میں آپ نے دلچسپیوں کا ایسا خزانہ سمو دیا ہے کہ کیا بیان کروں؟ آیندہ سے آپ صرف یہ لفظ لکھ کر لے آیا کریں۔ باقی قصہ ہم خود لکھ لیں گے۔

"ہونہہ" لڑکی غراتی ہوئی اپنا دل چسپ قصہ سینے سے لگائے باہر چل دی۔

"یہ لطیفے پڑھیں" اگلی لڑکی نے کہا۔ "جی بہترین لطیفے پر آپ انعام بھی دیتے ہیں نا؟"

"جی' مگر اس سوال پر کہ بچو! بتاؤ ان لطیفوں میں ہنسنے والی کون سی بات ہے؟ جو بچہ اس سوال کا جواب دے گا اسے انعام دیا جائے گا"۔

"مگر انعام میں کیا دیا جائے گا"

"یہی لطیفے" ہم نے کہا اور اگلی لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"جی یہ نظم ہے"

"اچھا یہ نظم ہے تو اس میں اتنی بد نظمی کیوں ہے" ہم نے کہا۔

"جی یہ آزاد نظم ہے" لڑکی نے جواب دیا۔

"آزاد؟ یہ تو بے راہ نظم نظر آرہی ہے۔ اس کو ذرا راہ راست پر لائیے" ہم نے نظم واپس کرتے ہوئے کہا اور وہ اداس ہو کر واپس چلی گئی۔

"یہ کہانی میں نے بہت محنت سے لکھی ہے" ایک دوسری لڑکی نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

جی ہاں محنت تو صاف ظاہر ہے' بھی مختلف رسالوں سے سطریں ڈھونڈنا اور انھیں جوڑنا واقعی بہت محنت کا کام ہے۔ لیکن تم نے یہ سطریں ڈھونڈ تو لیں۔ مگر کہانی لکھنا بھول ہی گئیں۔ جاؤ اس میں تھوڑی سی کہانی ڈال کر لاؤ تب بات بنے گی"۔

"ہم مگر کہانی کہاں سے ڈالوں" اس نے کہا۔

"وہیں سے جہاں سے یہ سطریں ڈالی ہیں"۔

"اچھا جی" اور وہ سر ہلاتی چلی گئی۔

یہ تو صرف ایک دو واقعات ہیں جو ہم نے لکھے ہیں۔ لیکن سارا دن جو ہم پر گزری وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ جیسے ہی شام کے پانچ بجے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اسی اثنا میں اڈیٹر بھائی کمرے میں داخل ہوئے اور مسکرا کر ہم سے پوچھا کہ کیا کچھ منتخب کیا ہے؟

"یہ ہمارے بس کا روگ نہیں" ہم نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا "اچھا خدا حافظ" ہم نے اڈیٹر بھائی کو سلام کیا۔ اور پھر ان کا جوابی "خدا ہی حافظ" سنتے ہی ہم سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے

(پانچواں انعام: 30 روپے کی کتابیں)

میں ڈاکٹر بنوں گا

عبدالحفیظ ظفر

کرتا ہوں خوب محنت
اس میں ہے میری عظمت
تعلیم کے لیے میں
ہر ایک دکھ سہوں گا
میں ڈاکٹر بنوں گا

ان کو ملے گی عزت
ہو گی انھیں مسرت
ماں باپ کی تمنا
پوری میں جب کروں گا
میں ڈاکٹر بنوں گا

خلق خدا کی خدمت
دراصل ہے عبادت
اس قول کو ہمیشہ
لے کے ظفر چلوں گا
میں ڈاکٹر بنوں گا

بلا عنوان

☆ اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 250 روپے کی کتابیں لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 جون

مئی کے بلا عنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو یہ تین عنوان: 'ٹیکنیکل گول' 'کھیل میں سب جائز ہے' اور 'باسکٹ بال اکیسویں صدی میں' پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کیے ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی یہ تین ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- مریم رضوان' سرگودھا (ٹیکنیکل گول' پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- محمد فیصل راجپوت' حیدر آباد (کھیل میں سب جائز ہے' دوسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- جمال عبدالناصر' پنڈدادن خان (باسکٹ بال اکیسویں صدی میں' تیسرا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

تقریب تقسیم انعامات

سوسائٹی گرلز پرائمری اسکول گلاب دیوی ہسپتال

رپورٹ: شازیہ برکت

ویلفیئر سوسائٹی گرلز پرائمری اسکول گلاب دیوی ہسپتال 18 جنوری 1989ء سے اپنی مدد آپ کے تحت چل رہا ہے۔ یہاں ہسپتال کی مختلف وارڈز میں موجود مریض بچوں اور نزدیکی آبادیوں کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر سال اسکول اور ہسپتال کی مختلف وارڈز کے پوزیشن حاصل کرنے والے بچوں کو ویلفیئر سوسائٹی اور ادارہ تعلیم و تربیت کی طرف سے انعامات دیئے جاتے ہیں۔

اس سال جب اسکول اور وارڈ کے بچوں کے سالانہ نتائج کا اعلان ہوا تو اس موقع پر ایک انتہائی سادہ مگر بہت دل چسپ تقریب منعقد کی گئی۔ مہمانوں، اساتذہ، اسکول اور وارڈ کے بچوں کے لیے اسکول کے ہال میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میزوں پر پڑے ہوئے انعامات جگ مگا رہے تھے۔ بچے پروگرام کے وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مہمان خصوصی ڈاکٹر رضوان ثاقب ہال میں داخل ہوئے تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ نرسری کے ایک بچے نے مہمان خصوصی کو پھول پیش کیے۔ اس اسکول میں کئی سالوں سے تعلیم و تربیت باقاعدگی سے آتا ہے اور بچے اسے پڑھ کر بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر کو اپنے درمیان دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے۔ ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

تھوڑی دیر بعد دیگر مہمانان گرامی جن میں جمیلہ پیر، نجمہ بھنڈاری، نسیم شوکت (سابق ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن پنجاب یونی ورسٹی)، ڈاکٹر فہمیدہ اور ڈاکٹر نصرت (ڈی ایم ایس گلاب دیوی ہسپتال) شامل تھے، بھی تشریف لے آئے۔ جب کہ سوشل ویلفیئر آفیسرز فرحت، خالدہ اور شاہدہ بھی اسٹیج پر جلوہ افروز تھیں۔ اس اسکول کی ایک ٹیچر نبیلہ اسماعیل نے مہمانوں کو پروگرام کی تفصیل بتائی پھر پانچویں جماعت کی طالبہ صائمہ کی تلاوت سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ پھر پانچویں جماعت کی طالبہ نعیم اور وارڈ میں سے آئی ہوئی بچی نازیہ نے ایک ایک نعت سنائی۔ اس کے بعد پانچویں جماعت کی بچیوں نے مل کر نعت پڑھی۔ پہلی کلاس کی بچیوں نے ایک ٹیبلو کی صورت میں اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ اب پروگرام بتدریج دل چسپی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وارڈ سے آئے ہوئے بچے عثمان نے نظم پڑھی، پانچویں جماعت کے بچوں نے ڈراما پیش کیا۔ پھر روایتی ڈانس اور قومی گیت پیش کیے گئے۔ جنھیں ناظرین نے بہت پسند کیا۔ اور اب مرحلہ تھا انعامات کی تقسیم کا۔ پانچویں جماعت کے سالانہ امتحان میں اول ناصر پرویز، دوم عائشہ انور اور سوم رخسانہ نثار جبکہ چہارم صائمہ ناز رہیں، چوتھی جماعت میں مصباح ناز اول، روزینہ اسحاق دوم اور شفیق احمد نے سوم پوزیشن حاصل کی۔ تیسری جماعت میں رقیہ بانو اول رابعہ سلیم دوم آسیہ حیدر سوم اور سائرہ بانو چہارم رہیں۔ علی بابا وارڈ میں اول عدنان، دوم عثمان اور سوم الیاس رہے۔ گاما وارڈ میں اور حاجی عبدالعزیز گرلز وارڈ میں اول شکیلہ اسماعیل، دوم صائمہ اقبال، سوم نائلہ رحمان، چہارم رابعہ ناظم رہیں۔ پوزیشنیں حاصل کرنے والے یہ بچے اپنے انعام اور اسناد وصول کرنے کے لیے بے تاب نظر آرہے تھے۔ سب سے پہلے اسکول کی پرنسپل نے کام یاب ہونے والے طلبہ و طالبات اور ان کے اساتذہ کو مبارک باد دی پھر ڈاکٹر رضوان ثاقب نے پانچویں جماعت کے بچوں میں، جمیلہ پیر نے سوم اور چہارم جماعت کے بچوں کو انعامات دیئے۔ انعامات میں دیگر چیزوں کے علاوہ تعلیم و تربیت انعام یافتگان کے لیے بڑی دل چسپی کا حامل تھا۔

ہال میں موجود تمام بچوں میں ٹافیاں تقسیم کی گئیں۔ آخر میں مہمان خصوصی نے اپنے خطاب میں کہا "میں نے اتنا سادہ مگر پراثر پروگرام پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کم خرچ اور بالا نشیں کا صحیح مطلوب مجھے آج اس پروگرام میں معلوم ہوا ہے۔ بچوں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے ہر اسکول میں ایسے پروگرامات ہونے چاہیں"۔

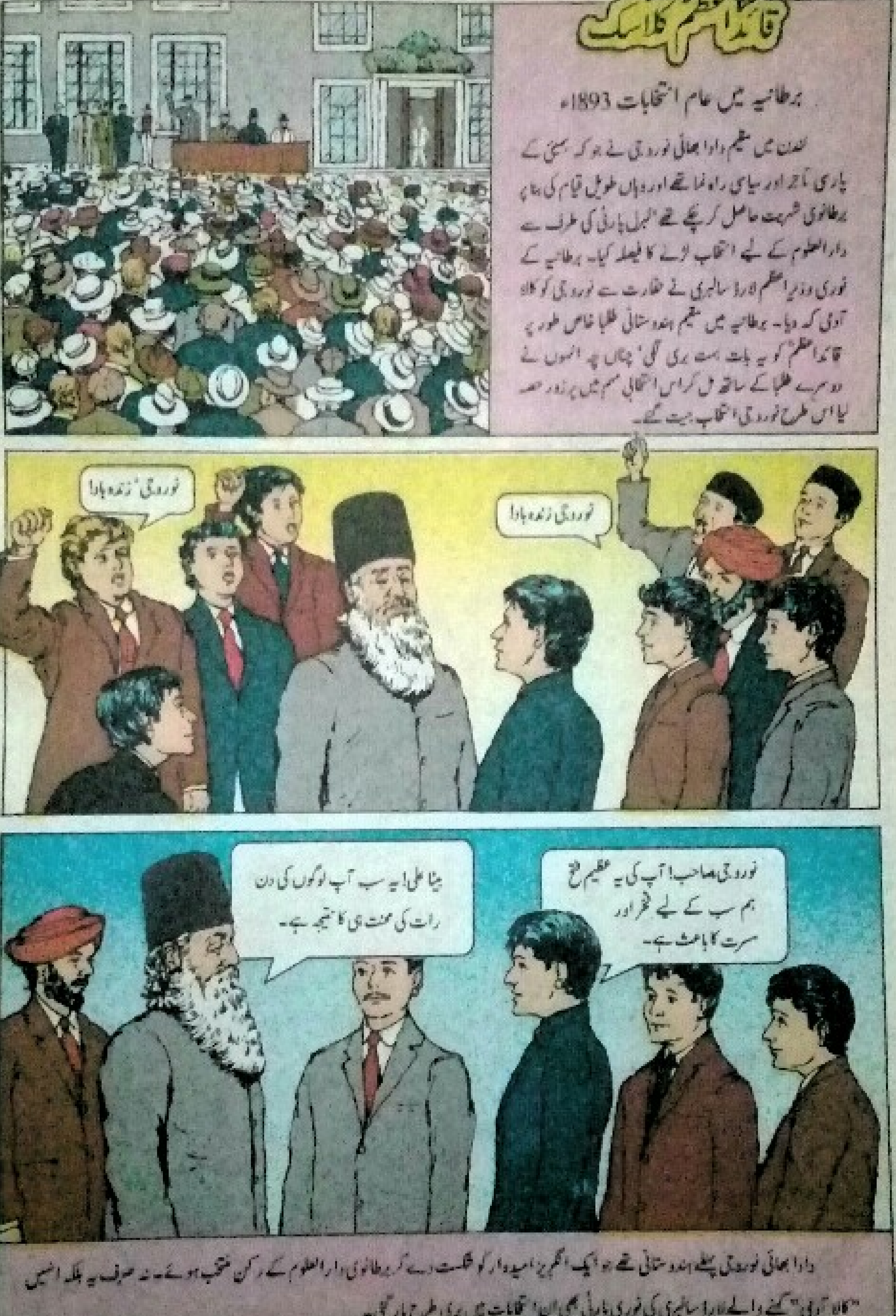
قائد اعظم کلاسک
برطانیہ میں عام انتخابات 1893ء
لندن میں مقیم دادا بھائی نوروجی نے جو کہ بمبئی کے پارسی تاجر اور سیاسی راہنما تھے اور وہاں طویل قیام کی بنا پر برطانوی شہرت حاصل کر چکے تھے لبرل پارٹی کی طرف سے دارالعلوم کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ برطانیہ کے ٹوری وزیر اعظم لارڈ سالبری نے حقارت سے نوروجی کو کالا آدمی کہہ دیا۔ برطانیہ میں مقیم ہندوستانی طلبا خاص طور پر قائداعظم کو یہ بات بہت بری لگی' چناں چہ انھوں نے دوسرے طلبا کے ساتھ مل کر اس انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس طرح نوروجی انتخاب جیت گئے۔
نوروجی' زندہ باد!
نوروجی زندہ باد!
نوروجی صاحب! آپ کی یہ عظیم فتح ہم سب کے لیے فخر اور مسرت کا باعث ہے۔
بیٹا علی! یہ سب آپ لوگوں کی دن رات کی محنت ہی کا نتیجہ ہے۔
دادا بھائی نوروجی پہلے ہندوستانی تھے جو ایک انگریز امیدوار کو شکست دے کر برطانوی دارالعلوم کے رکن منتخب ہوئے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھیں "کالا آدمی" کہنے والے لارڈ سالبری کی ٹوری پارٹی بھی ان انتخابات میں بری طرح ہار گئی۔

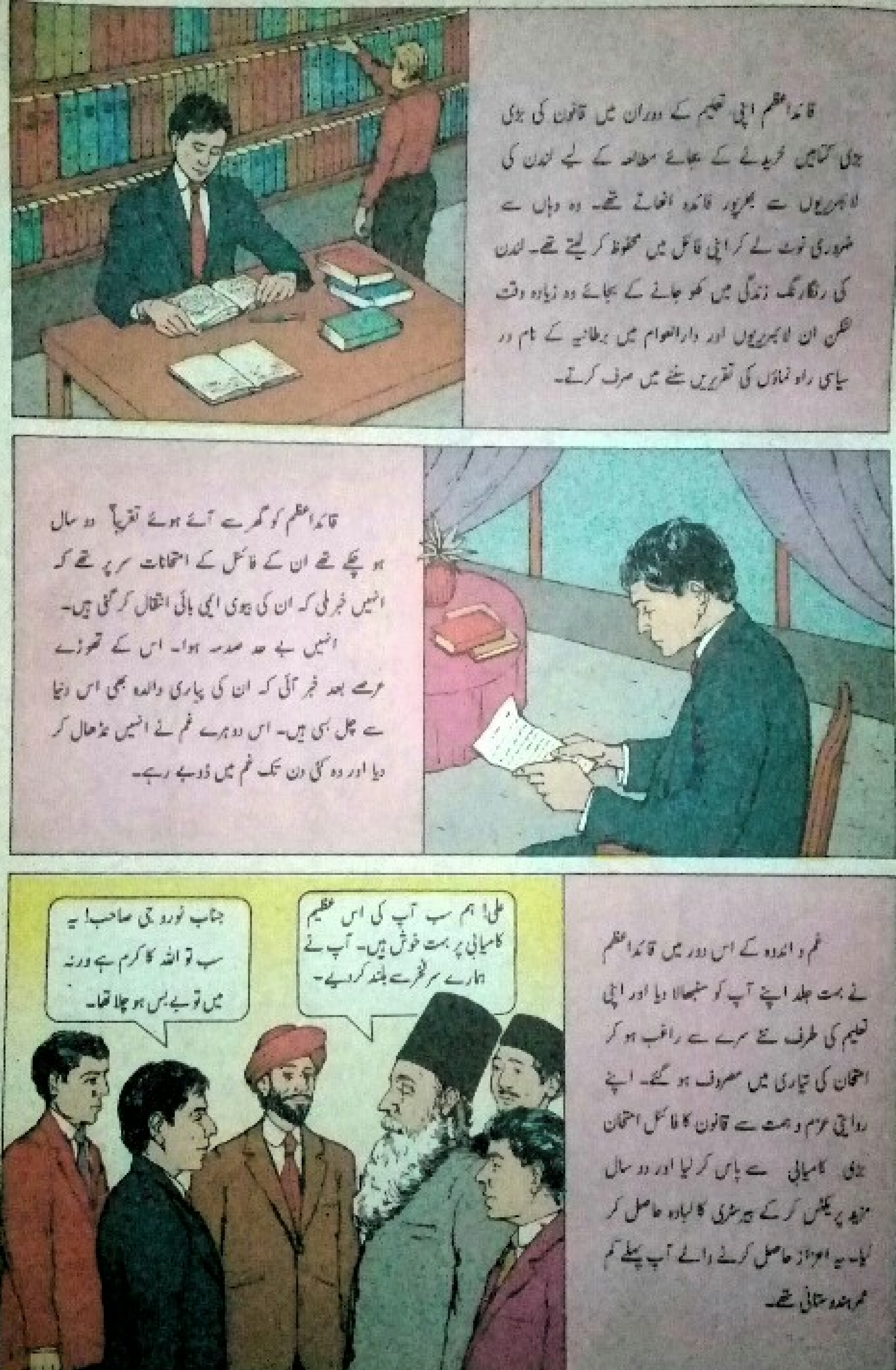
قائداعظم اپنی تعلیم کے دوران میں قانون کی بڑی بڑی کتابیں خریدنے کے بجائے مطالعہ کے لیے لندن کی لائبریریوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ وہاں سے ضروری نوٹ لے کر اپنی فائل میں محفوظ کر لیتے تھے۔ لندن کی رنگارنگ زندگی میں کھو جانے کے بجائے وہ زیادہ وقت لنکن ان لائبریریوں اور دارالعوام میں برطانیہ کے نامور سیاسی راہ نماؤں کی تقریریں سننے میں صرف کرتے۔
قائداعظم کو گھر سے آئے ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے ان کے فائنل کے امتحانات سر پر تھے کہ انہیں خبر ملی کہ ان کی بیوی ایمی بائی انتقال کر گئی ہیں۔ انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد خبر آئی کہ ان کی پیاری والدہ بھی اس دنیا سے چل بسی ہیں۔ اس دوہرے غم نے انہیں نڈھال کر دیا اور وہ کئی دن تک غم میں ڈوبے رہے۔
غم و اندوہ کے اس دور میں قائداعظم نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھالا دیا اور اپنی تعلیم کی طرف نئے سرے سے راغب ہو کر امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اپنے روایتی عزم و ہمت سے قانون کا فائنل امتحان بڑی کامیابی سے پاس کر لیا اور دو سال مزید پریکٹس کر کے بیرسٹری کا لبادہ حاصل کر لیا۔ یہ اعزاز حاصل کرنے والے آپ پہلے کم عمر ہندوستانی تھے۔
علی! ہم سب آپ کی اس عظیم کامیابی پر بہت خوش ہیں۔ آپ نے ہمارے سر فخر سے بلند کر دیے۔
جناب نوروجی صاحب! یہ سب تو اللہ کا کرم ہے ورنہ میں تو بے بس ہو چلا تھا۔

باقی آئندہ

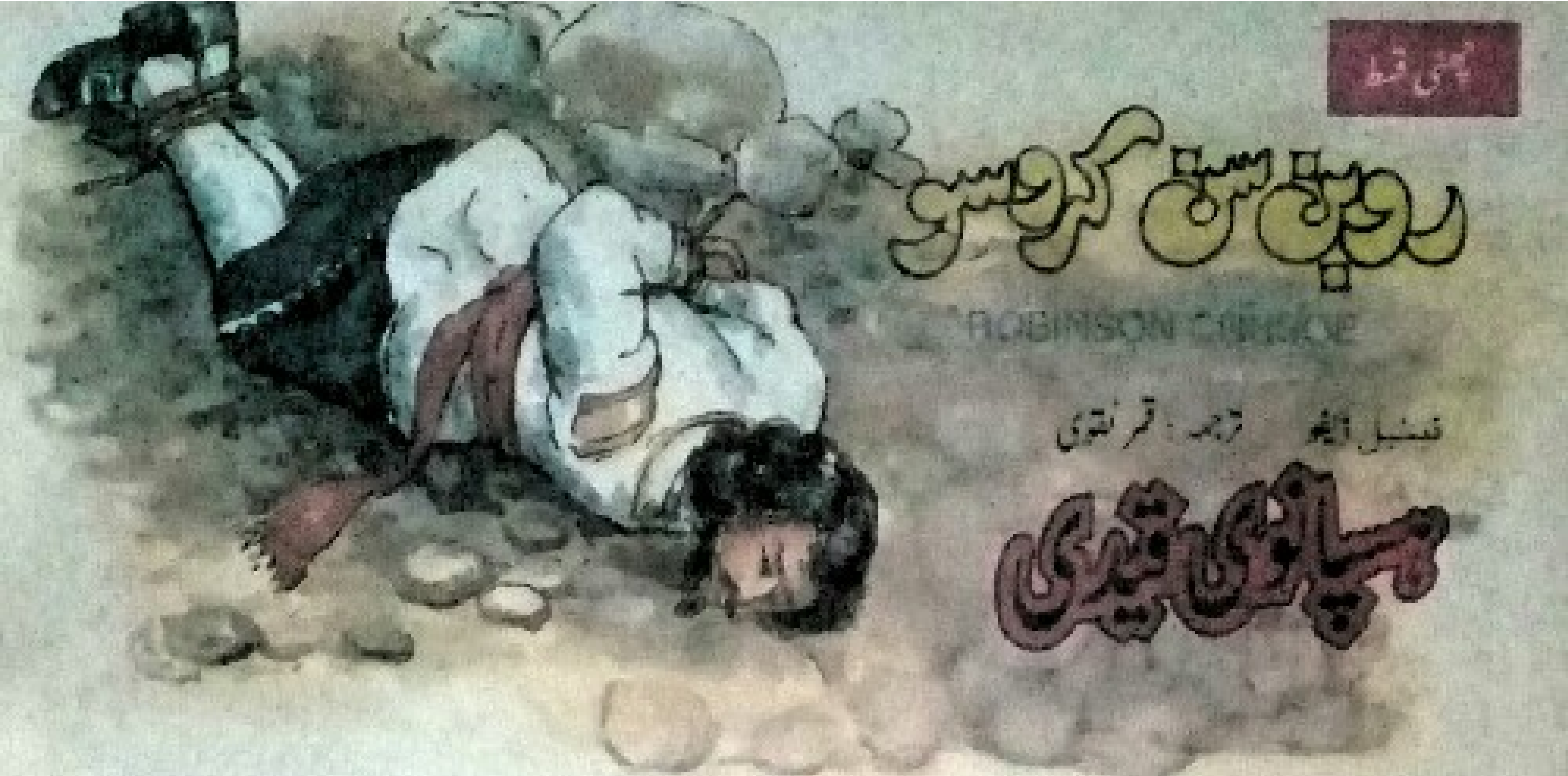

چھٹی قسط

روبنسن کروسو

ROBINSON CRUSOE

ڈینیل ڈیفو   ترجمہ: قمر نقوی

ہسپانوی قیدی

جب فرائی ڈے پوری طرح میری بات سمجھنے لگا اور خود بھی اپنی بات مناسب الفاظ میں بیان کرنے لگا تو میں نے اس کو اپنا قصہ سنایا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میرا جہاز اس جزیرے کے قریب تباہ ہو گیا تھا۔ میں اکیلا زندہ بچا اور اس جزیرے پر آ کر رہنے لگا۔ میں نے اس کو وہ جگہ بھی دکھائی جہاں ہسپانیہ کا جہاز تباہ ہوا تھا اور ابھی تک چٹانوں میں پھنسا ہوا تھا۔ فرائی ڈے اسے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ ایسا ہی ایک جہاز اس کے گاؤں کے قریب بھی طوفان سے تباہ ہو گیا تھا۔ ہم نے کچھ لوگوں کو بچا لیا تھا باقی ڈوب گئے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اس میں انگریز بھی تھے۔ اس نے کہا کہ اس میں انگریز ہی تھے۔ میں نے پوچھا کتنے آدمی تھے؟ اس نے انگلیوں پر گن کر بتایا کہ 17 آدمی تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کہاں گئے؟ اس نے بتایا کہ وہ اس کے قبیلے ہی میں رہتے تھے۔ میرا خیال تھا ان لوگوں نے ان کو مار کر کھا لیا ہو گا لیکن فرائی ڈے نے مجھے یقین دلایا کہ وہ زندہ ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا آخر ان لوگوں کو قبیلے والوں نے مار کر کھایا کیوں نہیں؟ فرائی ڈے نے جواب دیا کہ ان کی ان سے دوستی ہو گئی اور وہ لوگ آپس میں بھائی بن گئے۔ قبیلے والے عام آدمیوں کو نہیں کھاتے صرف دشمنوں ہی کو کھاتے ہیں۔ میں نے سوچا کسی طرح فرائی ڈے کے قبیلے میں جانا چاہیے۔ لیکن میرے پاس کوئی مضبوط کشتی نہ تھی۔ میں نے ایک بہت بڑا درخت فرائی ڈے کی مدد سے کاٹ کر گرایا اور اس کے تنے سے کینو بنانے لگا۔ جزیرے پر اتنے درخت تھے کہ ان سے کینو تو کیا جہاز تیار کیے جا سکتے تھے۔ اس دفعہ میں نے درخت پانی کے بالکل کنارے گرایا تھا تاکہ کشتی تیار ہوتے ہی اسے پانی میں اتارا جا سکے۔

فرائی ڈے کو اوزار کا استعمال نہیں معلوم تھا۔ وہ تنے کو کھوکھلا کرنے کے لیے اسے جلانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کو کھوکھلا کرنے کی ترکیب بتائی اوزاروں کا استعمال سکھایا۔ تھوڑی دیر میں وہ ان سے اچھی طرح کام کرنے لگا۔ کوئی ایک مہینے میں ہم نے یہ کام ختم کیا۔ یہ کینو بہت مضبوط تھا اور خوب صورت بھی تھا۔ اس کے بعد ہم نے اس کو پانی میں اتارا۔ پانی میں اترنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس پر 20 آدمی آرام سے سفر کر سکتے ہیں۔ میں نے اس میں مستول اور بادبان بھی لگا دیے۔

فرائی ڈے کو کشتی کھینا اور چپو چلانا تو خوب آتا تھا مگر بادبانوں کا استعمال اسے بالکل معلوم نہ تھا۔ میں نے

اس کو بادبان کا استعمال بھی سکھا دیا اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بادبان سے کشتی بہت تیز چل سکتی ہے۔

ایک روز میں کام میں مصروف تھا۔ میں نے فرائی ڈے کو حکم دیا کہ وہ ساحل پر جائے اور ایک بڑا سا کچھوا تلاش کرے۔ کچھوا ہم تقریباً" ہر ہفتے پکڑ لیتے تھے۔ اس کے انڈے بھی کھاتے اور گوشت بھی۔ فرائی ڈے کو ساحل کی طرف گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ بھاگتا ہوا واپس آیا اور میرے پوچھنے سے پہلے ہی کہنے لگا کہ ساحل پر تین بڑے بڑے کینو کھڑے ہیں۔ یقیناً جنگلی آدم خور آئے تھے۔

میں نے اس کو دو بڑی بندوقیں لانے کو کہا۔ جب وہ لے کر آ گیا تو میں نے ان بندوقوں میں چھرے بھر دیئے۔ پھر میں نے چار چھوٹی بندوقیں لیں اور ان میں بھی گولیاں بھر دیں۔ اس کے بعد تلوار کمر سے باندھی اور فرائی ڈے کو ایک کلہاڑی دے دی۔ اس طرح مسلح ہونے کے بعد میں نے دوربین اٹھائی اور پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اب جو میں نے ساحل کی طرف دیکھا تو مجھے 21 جنگلی نظر آئے۔ ان کے ساتھ دو قیدی تھے۔ مجھے فوراً" ہی معلوم ہو گیا کہ یہ آدم خور ان کو بھون کر کھانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں فوراً" نیچے اتر آیا۔

میں نے فرائی ڈے کو ایک بھرا ہوا پستول دیا اور تین بندوقیں اس کے کاندھے پر رکھ دیں۔ میں نے بھی ایک پستول اور تین بندوقیں اٹھا لیں۔ پھر میں نے فرائی ڈے کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے کو کہا اور خاموش رہنے کی تاکید کی۔ اس طرح ہم اپنے گھر سے نکلے۔

یہاں سے ہم لوگ سیدھے جنگل میں گھس گئے۔ میں چاہتا تھا کہ ان جنگلیوں کے قریب پہنچ جاؤں۔ ہم بالکل خاموشی سے چلتے رہے اور آخر جنگل کے کنارے پر پہنچ گئے۔ اب جنگلیوں اور ہمارے درمیان جنگل کا ایک قطعہ تھا۔

یہاں پہنچ کر میں نے فرائی ڈے کو قریب بلایا اس سے کہا کہ ایک بڑے درخت پر چڑھ جائے اور وہاں سے دیکھے کہ جنگلی کیا کر رہے ہیں۔ فرائی ڈے فوراً" درخت پر چڑھ گیا اور جنگلیوں کو دیکھا۔ پھر درخت سے اتر کر اس نے بتایا کہ وہ لوگ آگ کے گرد بیٹھے ہیں اور ایک قیدی کا گوشت بھون کر کھا رہے ہیں۔ دوسرا قیدی رسی سے بندھا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے۔

فرائی ڈے نے بتایا کہ یہ قیدی جنگلیوں کے قبیلے کے نہیں بلکہ سفید فام ہیں۔ یہ بات سن کر میرے غصے کی حد نہ رہی۔ میں نے دوربین سے دیکھا۔ واقعی وہ سفید فام تھا اور رسیوں سے بندھا ریت پر پڑا تھا۔ وہ کپڑے بھی پہنے ہوئے تھا۔

اس جگہ سے کچھ دور درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ میں نے اچھی طرح اندازہ کر لیا کہ اگر ہم چاہیں تو اس جھنڈ تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں سے فائر بہت اچھا کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت غصے کی وجہ سے میری بری حالت ہو رہی تھی لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور جھاڑیوں کی آڑ میں چل کر اس جھنڈ تک پہنچ گیا۔ یہاں سے میں ان جنگلیوں کو صاف دیکھ سکتا تھا کیوں کہ اب میں ان سے صرف 80 گز کے فاصلے پر تھا۔

اب وقت ضائع کرنا مناسب نہ تھا۔ 19 جنگلی ایک دوسرے سے مل کر بیٹھے ہوئے تھے اور اسی وقت ان کے دو ساتھی زندہ قیدی کو مارنے اٹھے تھے۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ وہ ان پر فائر کرے۔ اس نے فوراً" فائر کیا ساتھ ہی میں نے لبلبی دبا دی۔

فرائی ڈے کا نشانہ مجھ سے اچھا لگا۔ اس نے دو آدمی مار لیے جبکہ میرے فائر سے صرف ایک آدمی مرا۔ پھر فرائی ڈے کے فائر سے تین آدمی زخمی ہوئے اور میرے فائر سے دو۔ وہ لوگ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کدھر بھاگیں۔

ابھی وہ کھڑے ہی تھے کہ میں نے ان پر فائر کیا۔ فرائی ڈے نے بھی فوراً" ہی دوسرا فائر کیا۔ اس دفعہ صرف دو آدمی گرے لیکن زخمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اب وہ لوگ چیختے چلاتے کشتیوں کی طرف بھاگے مگر راستے میں تین اور ہم نے گرا لیے۔

اب میں دوڑتا ہوا جنگل سے نکلا اور حلق کا پورا زور لگا کر ان کو للکارا۔ پھر میں بھاگ کر قیدی کی طرف گیا جو زمین پر پڑا تھا۔ آدم خور جنگلی اپنی کشتیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ ان پر فائر کرے۔ وہ میری بات سمجھ گیا اور جنگلیوں کے پیچھے دوڑا۔ کوئی 40 گز کے فاصلے سے ان پر فائر کیا۔ اس وقت وہ لوگ ایک کینو میں بیٹھ رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ وہ سارے ہی مر گئے لیکن دراصل وہ چھپ گئے تھے۔

میں نے اس عرصے میں چاقو نکال کر زمین پر پڑے

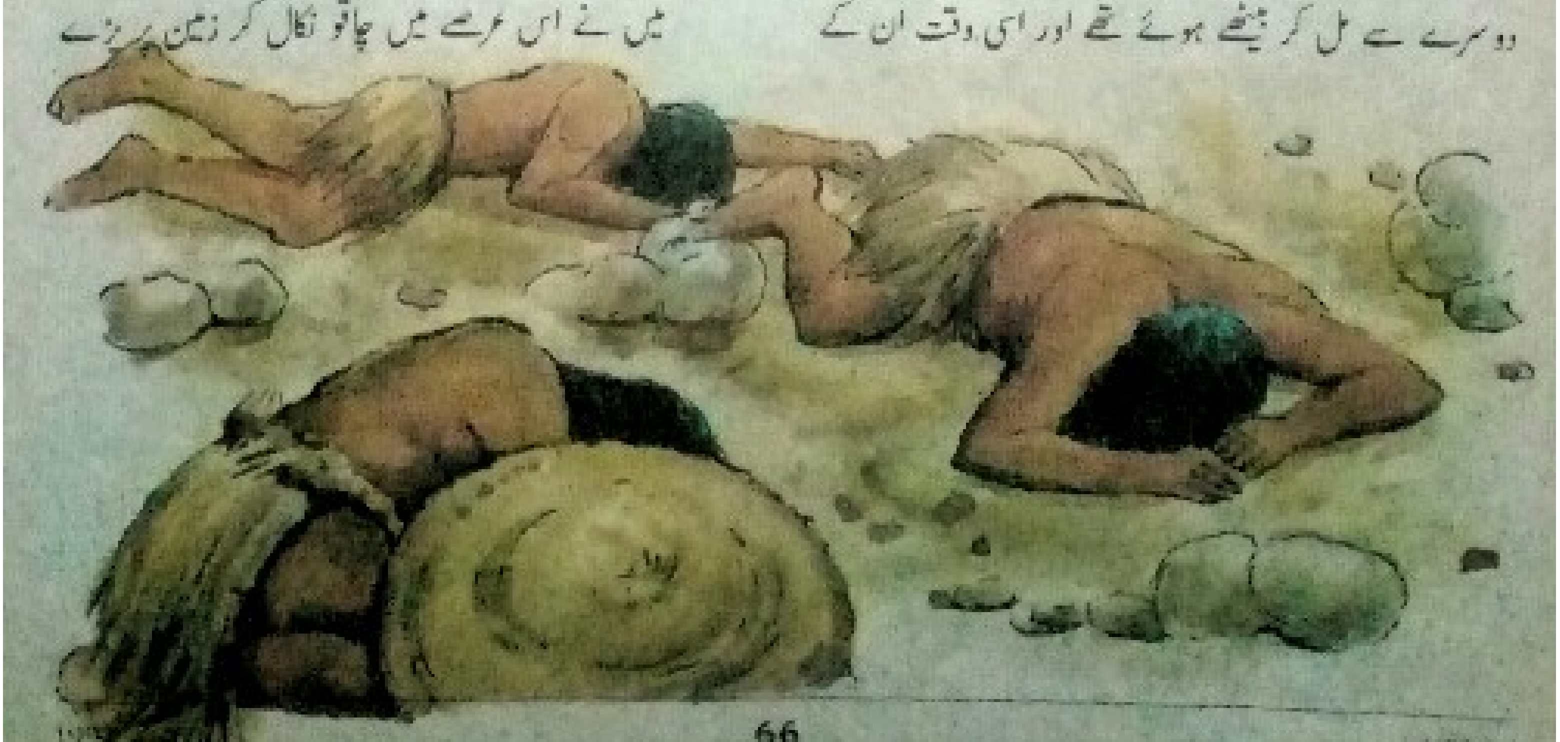

ہوئے قیدی کے ہاتھوں پیروں کی رسیاں کاٹ دیں اور پیچھے ہی وہ اٹھا میں نے بغیر کچھ کہے سنے ایک پستول اور ایک تلوار اسے دے دی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اس نے فوراً ہی بھاگ کر جنگلیوں پر حملہ کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو اور جنگلی ڈھیر ہو گئے۔

اب میں نے فرائی ڈے کو بلایا اور اس سے کہا کہ جا کر درخت کے جھنڈ سے اور بندوقیں اٹھا لائے۔ وہ بھاگ کر گیا اور بندوقیں لے آیا۔ بندوقیں خالی تھیں۔ میں فوراً ہی ان کو بھر دیا۔ پھر ان دونوں سے کہا کہ ان کی بندوقیں خالی ہو جائیں تو دوسری آ کر لے جائیں۔

فرائی ڈے جنگلیوں کی طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ تین آدمی جو زخمی ہو کر گرے تھے، فرائی ڈے نے پہلے تو ان کو مارا۔ پھر جو اس کے ہتھے چڑھا اس کو مار دیا۔

قصہ مختصر یہ کہ صرف تین جنگلی کینو میں بیٹھ کر بھاگ سکے باقی سب مارے گئے۔ میں دوڑ کر دوسرے کینو میں سوار ہو گیا اور فرائی ڈے سے کہا کہ وہ بھی آ جائے۔ میرا ارادہ تھا کہ ان کا پیچھا کروں گا مگر جب کینو میں بیٹھے گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک آدمی بندھا پڑا ہے۔ جب فرائی ڈے وہاں آیا اور اس نے اس قیدی کو دیکھا تو اس کی عجب حالت ہو گئی۔ وہ اس کو کبھی پیار کرتا کبھی گلے لگاتا، کبھی ہنستا، کبھی روتا، کبھی گانے لگتا اور اچھلتا کودتا۔ آخر بڑی دیر کے بعد اس کے حواس درست ہوئے تو میں نے اس سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ خوشی کے مارے فرائی ڈے کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ یہ اس کا باپ ہے۔

جنگلی اپنے کینو میں بیٹھ کر نکل گئے تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ ہم نے ان کا تعاقب نہیں کیا کیوں کہ فوراً ہی تیز ہوا چلنے لگی اور پھر ایک دم آندھی آ گئی جو تمام دن اور تمام رات چلتی رہی۔ مجھے یقین ہے کہ جنگلیوں کی کشتی اس آندھی میں غرق ہو گئی ہو گی۔

فرائی ڈے کشتی سے نکل کر گھر کی طرف بھاگا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک برتن تھا۔ اس نے یہ پانی اپنے باپ کو پلایا۔ وہ بہت پیاسا تھا اور پیاس کی وجہ سے مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ جس گورے آدمی کو میں نے بچایا تھا، وہ سپین (ہسپانیہ) کا رہنے والا تھا اور انگریزی نہیں سمجھتا تھا۔

ان سب کو ساتھ لے کر میں اپنے گھر آ گیا۔ ان کو آرام سے بٹھایا اور خود کھانا تیار کرنے لگا۔ میں نے نہایت عمدہ گوشت بھونا اور پھر اس میں کچھ چاول اور جو بھی ملا دیے۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو سب ساتھی کھانے لگے۔ وہ دونوں ابھی میری زبان نہیں سمجھتے تھے لیکن ہسپانوی میری زبان خوب سمجھتا تھا۔ فرائی ڈے میری بات کا ترجمہ کر کے ان کو سمجھاتا اور ان کی بات انگریزی میں مجھے بتاتا۔

جب ہم کھا پی کر مطمئن ہو گئے تو میں نے فرائی ڈے کے باپ سے پوچھا کہ اس کے قبیلے میں کتنے سفید فام آدمی ہیں؟ اس نے بتایا کہ اٹھارہ تھے دو کو یہ جنگلی پکڑ کر لے آئے باقی وہیں ہیں۔ اس کے بعد ہسپانوی نے بتایا کہ ہمارا جہاز تباہ ہوا تو ہم اٹھارہ آدمی ایک کشتی میں بیٹھ کر اس جزیرے تک پہنچ گئے جہاں فرائی ڈے کا قبیلہ آباد ہے۔ باقی لوگ سمندر میں ڈوب گئے ہوں گے۔ ہم کافی عرصے تک اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ شاید کوئی جہاز ادھر آ نکلے، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ یہ جنگلی جو ہمیں پکڑ کر لائے تھے فرائی ڈے کے قبیلے کے دشمن ہیں اور ان میں اکثر لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ یہ سن کر میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ تم مجھے اپنے قبیلے میں لے چلو، ہم ان بدنصیب سفید فام لوگوں کو بھی یہیں لے آئیں گے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ جزیرہ یہاں سے کتنی دور ہے۔ فرائی ڈے نے بتایا کہ اگر ہوا موافق ہو تو ہم کشتی کے ذریعے دو گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔

مجھے وہاں جانے پر آمادہ دیکھ کر ہسپانوی بولا کہ

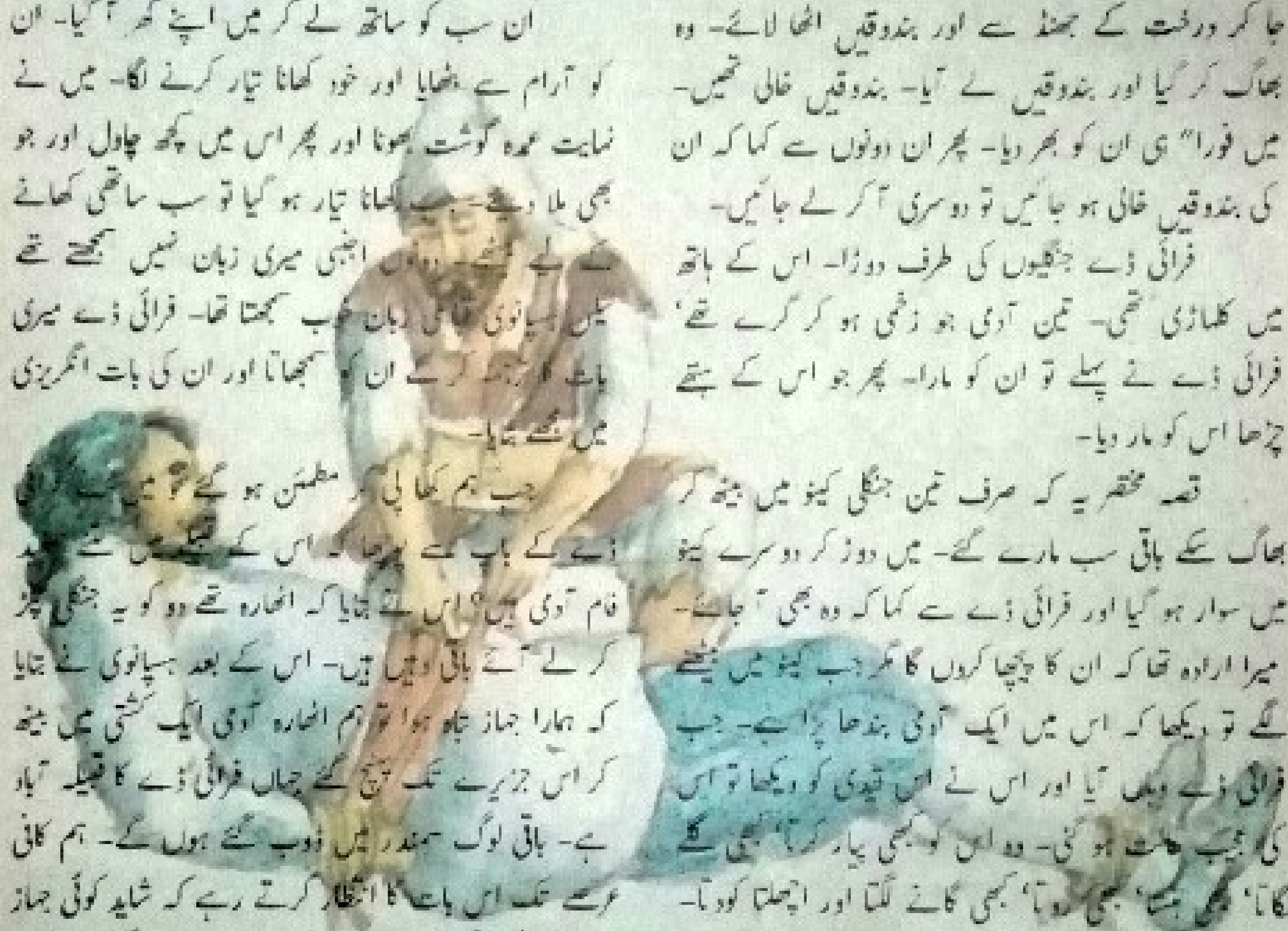

آپ کا ارادہ بہت نیک ہے۔ واقعی آپ کو ان کی مدد کرنی چاہیے لیکن اب نہیں چھ سات مہینے ٹھہر جایئے۔ اس عرصے میں ہم ان کے لیے غلہ پیدا کر لیں گے ورنہ سب کو تکلیف اٹھانی پڑے گی۔

ہسپانوی کی یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ہم نے فوراً ہی زمین کا ایک نیا قطعہ تیار کیا اور اس میں کاشت شروع کر دی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی بکریوں کے ریوڑ کو بھی بڑھانا شروع کیا۔ اسی زمانے میں انگوروں کا موسم بھی آ گیا اور میں نے انگوروں کے بے شمار خوشے دھوپ میں سوکھنے کے لئے لٹکا دیئے۔ ہم روٹی کے ساتھ عام طور پر کش مش کھاتے تھے اور یہ ہماری خوراک کا ایک اہم حصہ تھا۔

آخر فصل کاٹنے کا وقت بھی آ گیا۔ اس سے ہمیں جتنا غلہ حاصل ہوا' وہ آنے والے لوگوں کے لئے سال بھر کے لیے کافی تھا۔ جب یہ سب انتظام ہو گیا تو میں نے ہسپانوی سے کہا کہ تم فرائی ڈے کے باپ کے ساتھ جاؤ اور ان لوگوں کو لے آؤ۔ میں نے ان دونوں کو ایک ایک بندوق' آٹھ آٹھ گولیاں اور کچھ بارود بھی دی اور تاکید کی کہ بندوقوں کو صرف اشد ضرورت کے وقت ہی استعمال کریں۔

ان دونوں کو گئے آٹھ روز گزر گئے۔ ایک روز میں سو رہا تھا کہ فرائی ڈے کے شور و غل نے مجھے جگا دیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "مالک' مالک' وہ آ گئے"۔

میں جلدی اٹھ کر پہاڑی پر چڑھا اور ساحل کی طرف دیکھا تو ایک کشتی آتی نظر آئی۔ لیکن جس طرف ہسپانوی گیا تھا وہ اس طرف سے نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دوربین لگا کر دیکھا تو بہت دور سمندر میں ایک جہاز نظر آیا جو لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ یہ کشتی اسی جہاز سے آئی تھی۔ جہاز برطانوی معلوم ہوتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ اس ویران جزیرے کی طرف کیوں آ رہے ہیں؟ ان کا جہاز صحیح سلامت ہے کیوں کہ ان دنوں کوئی طوفان آیا ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ بحری ڈاکو نہ ہوں۔ خیریت اسی میں ہے کہ ان سے بچوں۔ میں چوروں اچکوں میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔

اتنے میں کشتی کنارے سے آ لگی اور اس میں سے 11 آدمی ساحل پر اترے۔ سب انگریز ہی تھے۔ ان میں سے 3 آدمیوں کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بندھے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ ساحل پر آ کر ادھر ادھر بکھر گئے جیسے جزیرے کو اچھی طرح دیکھنا چاہتے ہوں۔ تینوں قیدی ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہ بہت پریشان نظر آتے تھے۔

(باقی آئندہ)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
R.L.NO.4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

خوب صورت
جانور کتابوں میں

مختلف جانوروں کے متعلق نہایت خوب صورت، معیاری اور کم قیمت کی کتابیں جن سے
آپ اپنی خوب صورت لائبریری بنا سکتے ہیں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں
کو تحفے کے طور پر بھی پیش کر سکتے ہیں۔

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

FEROZSONS (Pvt.) LTD. LAHORE-RAWALPINDI-KARACHI